اپنی نگریا
افسانے
تاز شیریں

اپنی نگریا

ممتاز شیریں

مکتبہ جدید لاہور

صمد شاہین کے نام

جو مجھ میں موجود ہیں،

میرے افسانوں کے جسم میں موجود ہیں،
میری تنقید کی روح میں موجود ہیں!

ترتیب

دیباچہ

ممتاز شیریں اردو کے ان چند لکھنے والوں اور لکھنے والیوں میں سے ایک ہیں جن کی تاریخ ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔ انہیں مشہور ہونے کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑا، بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد انہوں نے ادب کے شائقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ پھر جب "نیا دور" میں اردو افسانے کے متعلق ان کا ایک طویل مضمون شائع ہوا تو لوگ اور بھی چونکے۔ اردو میں یہ بالکل نئی بات تھی کہ ایک ادیبہ نہ صرف افسانے ہی اچھے لکھے بلکہ معقول قسم کی تنقید بھی لکھ سکتی ہو۔ خیر، عورتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، عورتوں نے تو ابھی تک تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی ہی نہیں، خود مردوں میں بھی جو لوگ تنقید لکھتے ہیں اُن میں بھی چند ہی آدمی ایسے ہونگے۔ جن کا مطالعہ ممتاز شیریں کے برابر وسیع ہو ــــ خصوصاً ناول اور افسانے کے باب

ہیں، ان کے تنقیدی مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کو محض وقت گذارنے کے لئے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر پڑھا ہے، اور اپنے مطالعے سے کافی فائدہ حاصل کیا ہے، ان کی بہت سی رائوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر وہ اپنی تنقید کے ذریعہ اردو کو بہت سے نئے تجربوں اور نئے اسلوبوں سے روشناس کرا رہی ہیں۔

اُن کے افسانوں میں بھی ان کے مطالعے کا گہرا اثر ملتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو ممتاز شیریں کے افسانوں میں یہ ہے کہ اپنے افسانوں میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے انہوں نے کبھی سنسنی خیزی یا جنسی اور سیاسی اشتعال انگیزی کی کوشش کبھی نہیں کی۔ آج کل نئی افسانہ نگار خواتین میں یہ مرض وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ جنسیات کے متعلق کوئی بات بالکل منہ پھٹ طریقے سے کہہ دی جائے جس سے لوگ چونک پڑیں کہ ارے، لڑکی ہو کے اتنی بے حیائی! غرض کہ لکھنے والیوں کو شہرت کا بڑا سستا لٹکا حاصل ہو گیا ہے، ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اپنی دانست میں یہ لوگ عصمت چغتائی کی پیروی کرتی ہیں، مگر یہ عصمت کی سی فن کاری اور فنی سنجیدگی کہاں سے لاسکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ محض ایک پٹاخہ بن کے رہ جاتا ہے ــــ اور اب تو یہ جنسی پٹاخہ بہت ہی سیل گیا ہے۔ لیکن ممتاز شیریں نے ایسی ہوس ناکی سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ اس کے بالکل برخلاف رہا ہے۔ حالانکہ

اُن کے ایک افسانے، یعنی " انگڑائی" میں تو براہِ راست میلانِ ہم جنسی کا ذکر ہے لیکن اس موضوع کی تمام ترغیبات کا ممتاز شیریں نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا ہے اور اپنے افسانے میں اشتعال انگیزی تو کیا، کوئی تیز رنگ تک نہیں آنے دیا۔ انھوں نے میلانِ ہم جنسی کے افعال پر نہیں بلکہ احساسات پر اپنے افسانے کی بنیاد رکھی ہے بلکہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ انھوں نے میلانِ ہم جنسی کے عمل پر اتنا زور نہیں دیا جتنا میلانِ ہم جنسی کے خلاف ردِّ عمل پر۔ انھوں نے صرف یہی دکھانے پر اکتفا نہیں کی کہ بعض لڑکیاں میلانِ ہم جنسی کا شکار ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ بتایا ہے کہ صحت مندانہ ذہنیت والی لڑکیاں ایک خاص دور کے بعد اس چال سے آزاد بھی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ممتاز شیریں کا نقطۂ نظر بہت متوازن اور صحت مند ہے۔ دراصل ان کے کسی افسانے سے بھی شخصی ناآسودگی نہیں جھلکتی جو اردو کے ننانوے فی صدی افسانہ نگاروں کا سرمایۂ امتیاز ہے۔ ممتاز شیریں کے افسانے ایک اعتدال پسند اور متوازن مزاج کی پیداوار ہیں۔

اُن کے افسانوں کی یہ خصوصیت واقعی قابلِ غور ہے کہ ان کا ہر افسانہ نسائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نسائیت سے میرا مطلب جھوٹی شرم و حیا اور ریاکاری نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی، ملائمت، توازن، نرمی، اس بات میں ممتاز شیریں اردو کی زیادہ تر لکھنے والیوں سے الگ ہیں۔ عام طور سے ہماری افسانہ نگار خواتین کے یہاں مردوں کی سی کرختگی ملتی ہے، نہ صرف لب و لہجہ میں بلکہ افسانے کی تکنیک تک میں، ممتاز شیریں

کے یہاں یہ کر ختگی نام کو نہیں۔ بات یہ ہے کہ دوسری لکھنے والیاں تو جنس کے ذکر کے بغیر افسانے کا تصور کر ہی نہیں سکتیں ـــ یا بعض لکھنے والیاں اشتعال انگیز سیاست کے متعلق لکھتی ہیں جو بذاتِ خود ناآسودہ جنس کا ایک مظہر ہے۔ اس کے برخلاف ممتاز شیریں ہمیشہ انسانی کردار کے متعلق لکھتی ہیں۔ ایک بات میں تو انہوں نے نئے ادب کے مخالفوں کا بڑا پُر زور جواب بھی فراہم کر دیا ہے۔ یعنی بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے کہ نئے ادب میں زناکاری اور حرام کاری کی تبلیغ ہوتی ہے اور اخلاقی قدروں کو بالکل مٹایا جاتا ہے۔ ممتاز شیریں کے یہاں بالکل ہی الٹی بات ہے۔ ان کے افسانوں میں کسی کو بھول کر بھی تو حرام کاری کا خیال نہیں آتا، بلکہ انہوں نے سرے سے عام قسم کے عشق اور جنسی ترغیب کے متعلق لکھا ہی نہیں۔ ممتاز شیریں کے افسانے عامیانہ پن سے اتنے خالی ہیں کہ انہوں نے چھچوری عشق بازی کی طرف توجہ کی ہی نہیں۔ ایک لحاظ سے تو ان کے افسانے شادی کے ادارے کا پروپگنڈا ہیں۔ شروع سے آخر تک ان کے افسانے دیکھ جائیے، ایک بھی تو ایسا نہیں جس میں بیوی کو اپنے شوہر یا ہونے والے شوہر سے والہانہ محبت کرتے ہوئے نہ دکھایا گیا ہو۔ "رانی" کی ہیروئن ہر طرح کی محنت مشقت کرتی ہے کہ اپنے خاوند کو تھوڑا سا آرام پہنچا سکے۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہے۔ "شکست" میں بڈھے کو اپنی بیوی کی خدمت گذاری یاد آتی ہے۔ "آئینہ" میں تو گویا روایتی اقدار کی حمایت کی گئی ہے۔ شوہر اپنی بیوی سے انتہائی بُرا سلوک کرتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے

باوجود بیوی اس کے سارے قصور معاف کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مرتے وقت تک اُسی کا دم بھرتی ہے۔ "گھنیری بدلیوں میں"، "انگڑائی"، "اپنی نگریا"—— یہ سب کے سب افسانے بیوی کی والہانہ محبت کے متعلق ہیں۔ اس طرح ممتاز شیریں نے نئے ادب کے معترضین کی بھی شکایت دور کر دی ہے۔ ایک بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ ممتاز شیریں کے یہاں بیوی کی محبت محض جنسی کشش پر مبنی نہیں ہے، بلکہ انسانی تعلق پر جو جنسی کشش سے کہیں زیادہ استوار چیز ہے۔ ممتاز شیریں کے یہاں صرف موضوع کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ پوری فضا اور لب و لہجہ میں بھی ایک دبا دبا سا گھریلو پن پایا جاتا ہے جو ممتاز شیریں کی خاص چیز ہے۔

آیئے اب انفرادی طور سے ممتاز شیریں کے افسانوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ "شکست" اور "رانی" یہ دو افسانے غریب طبقے کے بارے میں ہیں۔ یہ بات تو ضرور ہے کہ یہ دونوں افسانے ترقی پسندی سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، اور ان میں وہ جان نہیں آسکی جو شیریں کے ان افسانوں میں ہے۔ جو متوسط طبقے کے بارے میں ہیں۔ مگر بہرحال ان کا خلوص جبلی اور ان کی ہمدردی بناوٹی نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے غریب طبقے کی زندگی کا ایک پہلو ہی ایسا چھانٹا تھا جس سے انہیں قلبی تعلق ہے، یعنی شوہر سے بیوی کی محبت یا انسانی کردار کی ایک بنیادی صفت، وفاشعاری، —— کسی دوسرے انسان سے یا اپنے اصولوں سے "شکست" میں انہوں نے صرف مزدور طبقے کی مصیبت دکھانے پر اکتفا نہیں کی، جیسا اکثر

"پرولتاری" ادیب کیا کرتے ہیں، بلکہ مزدور کو انسان سمجھ کر اور اس کی زندگی کو پورے انسانی پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ شیریں کے یہ دو افسانے ایک اور بڑی کمی پوری کرتے ہیں۔ اردو میں شمالی ہندوستان کے عوام کے متعلق تو بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس باب میں جنوبی ہند ابھی تک نمائندگی سے محروم تھا۔ شیریں نے یہ دو افسانے لکھ کر گویا اردو کی ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے۔

"انگڑائی" میں ایک قدرے غیر معمولی جذبے، یعنی میلانِ ہم جنسی کی عکاسی کی گئی ہے، اور بڑی احتیاط سے عامیانہ پن سے بچ بچ کر، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس افسانے کا مرکز محض میلانِ ہم جنسی نہیں ہے۔ بلکہ گلنار کی پوری شخصیت جو محض منجمد شخصیت نہیں ہے، بلکہ نشو و نما پا رہی ہے۔ چنانچہ شیریں نے اسی نشو و نما کے عمل کی تصویر کشی کی ہے۔ جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو گلنار ویسی کی ویسی ہی نہیں رہتی جیسے شروع میں تھی، بلکہ اب اس نے اپنی کینچلی اتار ڈالی ہے، اور ایک نئی گلنار بن گئی ہے۔ ایک خاص بات اس افسانے میں یہ ہے کہ گلنار میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے، اور اس تبدیلی کا سبب بھی اندرونی اور ذہنی عوامل ہیں۔ جدید اردو ادب میں بہت کم افسانے ایسے ملیں گے جو کردار کی ایسی فطری نشو و نما اور حیاتیاتی تبدیلی دکھاتے ہوں۔

"اپنی نگریا" ـــــ اس لحاظ سے ایک عجیب افسانہ ہے کہ اس میں انتہائی بے رنگ باتوں سے رومان پیدا کیا گیا ہے۔ معمولی باتوں میں معنویت ڈھونڈھنا ممتاز شیریں کے ادبی مزاج کا خاصہ ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ عجوبہ دکھایا گیا ہے کہ بے رنگ مشغولیتوں

سے میاں بیوی کی محبت میں کمی نہیں ہوتی، اور نہ ایک دوسرے کی شخصیت سے انہماک کم ہوتا ہے، بلکہ کام گویا محبت کا ایک عکس بن جاتا ہے۔

"گھنیری بدلیوں میں" — اس افسانے میں میاں بیوی کی محبت کا دوسرا رُخ پیش کیا گیا ہے۔ محبت کی شدت بذاتِ خود بدگمانیاں اور وسوسے پیدا کرتی ہے۔ شوہر کی مصروفیتیں بیوی کو اپنی رقیب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن آخر اس کی محبت بدگمانیوں پر غالب آجاتی ہے۔ اس پورے عمل کی تصویر اس افسانے میں بڑی نزاکت سے کھینچی گئی ہے۔ ٹکنیک کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ افسانہ ممتاز شیریں کے افسانوں میں سب سے صاف ستھرا ہے، اور اس میں غیر ضروری باتیں بالکل نہیں ہیں۔ افسانے کا نشو و نما شروع سے آخر تک بڑی ہمواری اور سبک روی سے ہوتا ہے، اور کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ لکھنے والے کے قدم ٹھیک طرح نہیں اُٹھ رہے ہیں۔

ویسے ممتاز شیریں کا بہترین افسانہ "آئینہ" ہے۔ یوں تو خیر اپنے آپ سے اور اپنے ماحول سے نکلنے کی کوشش انہوں نے "رانی" اور "شکست" میں کی ہے لیکن جیسا مکمل انسانی کردار انہوں نے یہاں پیش کیا ہے ویسا اپنے کسی اور افسانے میں نہیں پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ انسانی ہمدردی جیسی شدید اور پُرخلوس یہاں ہے وہ ان کے اور افسانوں میں نہیں ملتی۔ "شکست" میں بھی انہوں نے گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے لیکن انہیں بڈھے کی مصیبت پر اتنا رحم آگیا ہے کہ اس کے کردار

کے متعلق ہو۔ یہ معروضیت اور علاحدگی نہیں برت سکیں۔ "آئینہ" میں حالانکہ لفظی اعتبار
سے تو جگہ جگہ جذباتیت آگئی ہے، لیکن بڑھیا کا کردار پیش کرتے ہوئے شیریں نے
کافی ضبط سے کام لیا ہے۔ بات یہ ہے "شکست" میں تو انہیں بوڑھے کی جسمانی
تکالیف سے ہمدردی تھی، اور یہاں انہیں آپا کی روحانی لگن سے ہمدردی ہے۔
اسی وجہ سے ان دونوں افسانوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ افسانہ لکھ کر ممتاز شیریں نے
ثابت کر دیا ہے کہ وہ اکثر ایسے افسانے تو ضرور لکھتی ہیں جو تقریباً خود نوشت
سوانح عمری ہوتے ہیں، لیکن ان میں صلاحیت ہے کہ اپنی محدود شخصیت اور طبقے
کے ماحول سے باہر نکل سکیں، دوسری اہلیت ان میں یہ ہے کہ وہ صرف دوسروں
کی خارجی زندگی کا مشاہدہ ہی نہیں کر سکتیں، بلکہ ان کی ذہنی زندگی سے بھی اپنے
آپ کو اس حد تک مانوس بنا سکتی ہیں کہ ان کی فنی تشکیل کر سکیں، یہ چیز فن کار
کے لئے ایک بڑا سرمایہ ہے۔ اگر ممتاز شیریں اپنی اس صلاحیت کو ترقی دے سکیں،
اور انہوں نے خارجی کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ کی تو وہ ضرور اپنے لئے
اردو افسانے میں ایک جگہ پیدا کر لیں گی۔ ممتاز شیریں یقیناً ان افسانہ نگاروں میں
ہیں جن کا مستقبل بہت امید افزا نظر آتا ہے۔ اگر انہوں نے اپنے انفرادی رنگ
کو ابھارا تو یہ امید حقیقت میں بہت جلد تبدیل ہو جائے گی۔

دہلی، فروری ۱۹۴۷ء

محمد حسن عسکری

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور کیا کہنے بڑا ہی مزہ آرہا تھا......

بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امی۔ کہیں گی "کچھ کام بھی کروگی پڑھیں! تم ہو، آئینہ ہے اور بس۔ جب دیکھو آئینہ کے سامنے"...... نہیں آج امی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی! سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال تمتما رہے تھے...... ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لیئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فسٹ ڈویژن

میں کامیاب ہونا چاہیئے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز...... ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں ؟...... پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ بی اے ! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ ! اب تو میں گریجوٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا...... گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ پردۂ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو۔ یا کسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کیا تو اس پر کھینچا ہے...... اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ خوب ستائینگی۔ "مٹھائی کھلاؤ۔ مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہونگی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی۔ اور وہ کہتی تھیں "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے" اور مجھ سے شرطوں پر شرطیں باندھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی ہی دینی پڑے۔ ہاں کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے...... اوہ ! امی بھی ادھر آنکلیں۔

"آج میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امّی ؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے" آہا ! آج امّی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زینی کو ضرور بلاؤنگی وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر۔ اور صرف اسی کو معلوم ہے نا کہ...... اوں......

اماں! بڑی شریر ہے وہ تو سب سے کہدے گی۔ پروین کو ڈبل کنگریچولیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجوٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی ینگیجمنٹ (Eongagement) پر" اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی۔ اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنالوں گی .... ارے تو غصہ بھی مجھے بھاتا ہے۔ منہ پھلائے ہوئے میں بھی میں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا "غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو" لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ تو جس طرح بھی چاہے دیکھ لو..... ہاں۔ تو میں اپنے چہرے پر یوں مصنوعی غصہ پیدا کر دونگی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں۔ گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں۔ کیسا لطف آئیگا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذت..... چاء کے اختتام پر زینی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟..... ہاں وہ فلمی گیت گاؤنگی۔ وہ گیت ——

ساجنا جمنا پیچھے کھیلوں۔ کھیلوں اکیلی کیا؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زینی ایسی معنی خیز۔ ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو گی...... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی۔ ساتھ ہی

گدگداتی ہوئی "اکیلی اکیلی؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ ہونہہ! اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنا ساجن چاہیئے۔ اپنا —— نہ ہو تو"...... اُف —— میں —— کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی۔ میں —— کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا۔ ——

"چھوٹی بی بی"! "کیا ہے خیرن بی"۔ "ایک خبر سنانے آئی تھی"۔ "خبر"۔ میں نے مڑکر پوچھا۔ "ہاں ہاں کہو نا کیا خبر"

"ارے آج تو تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں۔ تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہوگئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بُری خبریں سنا کر رنجیدہ کروں۔ چھی چھی۔ توبہ توبہ" وہ جانے لگی۔

"ارے ٹھہرو خیرن بی! آخر کچھ معلوم بھی ہو"۔

"کچھ نہیں بی بی۔ وہ جو تمہارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا۔ وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں...... ارے توبہ میرے منہ سے تو نکل ہی گیا تھا نا بابا۔ چھی چھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں"۔

"میری خوشی جائے بھاڑ میں۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے"۔

"اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو؟ جس وقت

تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ نانی بی، کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں۔"
"امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں۔"
"کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں۔"
خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا۔"
گویا تصویروں کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی ——
اداسی کی جھلک —— اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

"نانی بی"—— میری بوڑھی انّا، وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی انّا کو مرنے سے پہلے ایک بار دیکھ لیتی میں کیا کچھ نہ دیدونگی۔ پھر اپنی انّا سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری انّا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو، ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے چمٹی ہوئی تھیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں!...... اور تم تو، نانی بی! چھوٹی

چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصوّر کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذراسی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں.....

ہاں میری انّا۔ تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امی۔ ابا کو بھی نہیں۔ گو ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی....

اور میری غریب انّا! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذراسی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ۔ پچکے ہوئے گال، روکھے سفید بال، پوپلا منہ، لٹکتے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں ـــ انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر! تمہاری یہ ہیئت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت ـــ ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ اور امّی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طلبِ رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پھیکی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔

ابا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے...... وہی خوف ملی ہوتی نفرت کا جذبہ...... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر، میری بوڑھی بے بس انّا، میں تمہیں چاہتی تھی، ننھے سے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی خلاسفر بنا دیا تھا۔ کیونکہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابّا کا علم، ان کی عمر، امّی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ مگر میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیونکہ مجھے تم سے محبّت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر لیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امّی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں۔ طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگواتیں۔ مگر میں مچلنے لگتی۔

"اوں، یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤنگی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی دینگی۔" امّی بڑبڑانے لگتیں۔ "کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں دلا کر بچی کی صحت

خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو لڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں
مٹھائی سنتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی
کھاؤں گی۔" امّی جھلا اٹھتیں "اری پروین! کہاں بھاگ چلی۔ خدایا اس بوڑھی
نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امّی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔
محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، میری ننھی پروین' ارے کیا نام ہے تمہارا
—— اونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس جمانے میں۔ ہم پرانے جمانے کی بوڑھیاں
کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی کیا میرا نام بھی بجرگوں نے کچھ ایسا ہی رکھا ہے۔ جھا۔ را۔
جہرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہجادی پکارا کرونگی۔ چھوٹی شہجادی ہاں
تم ایک شہجادی کی طرح کھبصورت ہو۔ ہوں، تو میری چھوٹی شہجادی کو کیا چاہیئے"
یہ مٹھائی تمہارے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی ہتھیلی پسار دیتی
نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی اس سوکھے ہاتھ
سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امّی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں
میں سجے ہوئے گلاب جامن۔ برفی۔ دودھ پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے
کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امّی سے نانی بی کا نام پوچھا۔ "نانی بی' اور کیا" انہوں نے
بے پروائی سے جواب دیا "نہیں امّی کچھ ایسا نام جھارا" "زہرہ" اور مجھے بڑا ہی
تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام "زہرہ" ایسا پیارا نام۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت
لڑکی کے نام کا سا! اور امّی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا۔ اوں۔

——امّی مجھے شہجادی کہو۔ پروین نہیں" امی سر پیٹ لیتیں۔" ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بوڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو۔" آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا بُرا معلوم ہوتا ہوگا۔ پھر جب نسیمؔ اور نسرینؔ پیدا ہوئے تو امّی نے یوں انتقام لینا شروع کیا۔ کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امّی مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی۔" نانی بی میں تم ... تمہاری بے ٹی ہوں۔ امی کی نہیں"۔ " رو نہ میری ننھی! میری شہجادی کو کس نے رلایا" وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو اور سامنے لا کر میری ٹھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں "میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کیسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہجادی کے سے کھوبصورت بھی تو نہیں"۔

آخر امّی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام لینے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی سے ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرانا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا۔ اور نانی بی اس سلیقہ سے سب کام

سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے
ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر! امی چپ ہو رہتیں۔ مگر، آخر یہ
ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسترن نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر
میں نے اسے زور سے نوچا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امیّ کے
پاس دوڑی۔ "ارے کیا ہوا میری بچی کو؟" ــــ ہونہہ ان کی بچی کو بچھو نے کاٹ
کھایا تھا ــــ امی کا یہ کہنا تھا کہ نسترن نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر
دیا۔ "آپا پروین نے میرا۔ منہ۔ نوچ لیا۔ خون۔ نکل۔ آیا ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں"
اف رے مکّاری گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امیّ نے مجھے گھسٹ کر طمانچے
پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ "نہیں امیّ نسترن نے
میری گڑیا توڑ دی ہے۔" میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امیّ کہیں
سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی۔ "اونہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا
دیں گے۔ گویا تیری موئی گڑیا میری مُنّی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان
ہوئے جا رہی ہے۔" اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس
ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ
دیکھتے ہی مجھے امیّ سے چھین لینا چاہا۔ "بیگم آخر کیوں بچی کو مارے دیتی ہو۔ کیا قصور
کیا تھا اس ننھی نے ننھی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی۔" امی کی آنکھوں
سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ "دور ہو

جاؤ۔" امی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں۔"

"نہیں بی بی، سوچو تو۔ ننھی سی جان ...... گستہ اتر نے پر تمہیں خود رنج ہوگا۔"

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے۔" امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑ تڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں۔ "اچھا لے جاؤ، اس دیوانی کو بھی لے جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔" امی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی منکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ "میرے اللہ خدا جانے کیوں کچھ روز سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔" نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میرے ہچکی بندھ بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور "نوکرانی کی بیٹی" کہہ کر قہقہہ لگاتی

ہوئی زد۔ سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا ٹوٹے۔ میں خود ہی خوب پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "نانی بی میں تمہارے ساتھ رہونگی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے نانی بی؟ میں امّی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کرونگی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہونگی"

میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟" پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھما نہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانے میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امّی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امّی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روئی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش، گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امّی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں۔ یک لخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امّی کو تک رہی تھی۔ امّی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں "میری بچی، مجھ سے ڈرتی ہے۔ کیوں ڈرتی ہو ننھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟" زہرہ بی! (امّی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو! تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے

والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ کہتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے میری ننھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟"

"بی بی، میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔"

"بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید چونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے۔ جادو کر دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بوڑھی سے مانوس ہو جاتی (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں کہے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دنوں تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موئی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ! میں بھی کتنی دیوانی ہوں! ادنیٰ نوکرانی سے دبوں؟" امّی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں "سنتی ہو، کان کھول کر سن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اب اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا، بستر باندھ لو...... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پہ بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے۔"

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آکر دیکھنے کی اجازت دو۔"

اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلا دے کا جریہ (ذریعہ) ہے
بی بی۔ اس کو بھی نہ چھین لو۔ کھُدا واسطے اتنا جُلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت
دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔"

"بچی کو دیکھنے، بچی کو دیکھنے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دونگی۔ اگر
پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ تمہاری منحوس صورت دکھائی!...... میری بچی
کو پھر مجھ سے چھیننے...... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں،" امی نے مجھے بھینچ
لیا۔ اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔ ان دونوں
مورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت۔ امیؔ کی
خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا
رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ
رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امیؔ کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں
سے۔ اگر ان پھیکی، بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں
میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر بظاہر وہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی
تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ مگر میرا ننھا دل
سچی انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور امیؔ کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین حسن"
اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے

پچکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ہاں مجھے امّی پر ترس آ رہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہو گا جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔امّی کے پاس دولت بھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔چاند سے بچے تھے، اس قسمت کی ستائی ہوئی بوڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی تو نہیں۔ہاں امّی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی۔اور اس سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔کیسا طوفان تھا۔

نسیم کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔امّی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کے گود میں جا بیٹھی۔" نانی بی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔نانی بی نے مجھے گلے لگا لیا۔بچہ کیا تھا جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔رکا ہوا سیلاب امڈ آیا۔ایسا معلوم ہو رہا تھا۔نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے "میری بچی، میری ننھی شہزادی۔ تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں"۔"اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟" "نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی"۔"کیوں نانی بی! مجھ سے روٹھ تو نہیں گئی ہیں تمہارے لئے سب کچھ کر دونگی۔تم جو کچھ کہو وہ سنونگی۔نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے"۔

"اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنوگی؟" "ضرور۔" "مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا نہ دو نا اچھی بیٹی"۔ نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی اپنے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکالا۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین ننھے موتیاں۔ کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں "ساورن" کہا کرتی تھی۔ سفید چمکتی ہوئی چونیاں، دونیاں...... اسی میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انھوں نے پیار سے چمکار کر کہا۔ "میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لا دونگی۔ یہ نہ لو" میں کوئی چیز مانگوں اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نہ، نہ کرتی تھیں۔ ہو نہ ہو اس میں کچھ ہوگا ہی اور میں آئینہ لینے پر مُصر ہوگئی۔ "ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی"۔ بچپن کی ضد۔ میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسو کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے ہی پاس رہا۔ کئی بار نانی بی نے ترسی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی۔ "ہوں، وہ غلیظ آئینہ

کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟" نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں۔ مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں، مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی، مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب روؤنگی۔"

"اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی وہیں آ کر جان و دل سے تمہاری کھدمت کرونگی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہونگی۔ پھر مجھ پہ دو مٹھی کھاک ڈال دینا بیٹی۔" نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لیکر میری بلائیاں لیں، گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ اور مجھے آہستہ سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ جب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بٹوے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری چیزیں تھیں۔ نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت

کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا ہوا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت۔ اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں۔ وہ آخری سین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں کو لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بارہا ابھرتی ہیں۔ یہ یادیں بارہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے؟ اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی، یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جا رہے تھے ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لیجایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے بہت دور نکل جاتے۔ ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خودرو گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی میٹھی بولی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آ بیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف

پان اور بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور
سیپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان
کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان
کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دکاندار اندر جاکر "پان کوٹنی" لے آتا، اور نانی بی کے
سامنے رکھ دیتا اتنے میں دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آجاتیں۔ سب کی سب
پان خرید کر "پان کوٹنی" کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں
بھی چلم لئے آجمتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی
دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی
ہوجاتی اور ان سب کی عجیب عجیب حرکتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بوڑھیاں
نسیں نکالتی ہوئی، پان کوٹتی ہوئی، اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے
اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی۔ پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں
کی اور اکثر "ہمارے جمانے" اور اب کے "جمانے کی" اب کے جیور بھی کوئی جیور
ہوتے! بابا اب کی چھوکریوں کا دماگ تو آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ ایک بوڑھی منہ
پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی۔ پرانے جیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ ہونہہ
ہاتھوں میں دو چوڑیاں، گلے میں باریک "سنکل" کانوں کی لو میں ایک "باریک" کرن
پھول یا جھومر اور بس بھلا یہ بھی کوئی جیور ہوئے۔ ہمارے جمانے میں جو پہنتی تھیں
کان بھر کر سونے کی بتیاں۔ ہاہا "نتھ اور دن" پہ جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں۔"

"اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ چھی چھی کیسی بری لگتی ہے ناک"۔ ایک بوڑھیا نتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

"نانا یہ جمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موٹی موٹی لٹیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں۔ سر کیا ہوا کھادکا جھوا ہوا۔" اور ٹیڑھی ٹیڑھی مانگ نکالے کیسے اِتراتی پھرتی ہیں۔ حشر کا دن پُل صراط پر سے پھسل پھسل کر نہ پڑیں تو جب جانیں۔ کیا ہمارے بزرگوں نے جھوٹ کہا تھا۔ "بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پل صراط طے کر لو"۔ اب تو اللہ ہی بچائے ان ٹیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو تو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ ٹیڑھی مانگ تو کیسی اچھی عورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھ لو بوا۔ کیسا پھول سا مکھڑا، چاند سی پیشانی، سیدھی مانگ نکالتی تو چہرہ پہ کیسی رونق آجاتی۔ اب تو کرسٹان لگتی ہے کرسٹان"۔ اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور بیرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ "اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن"۔

"واہ بوا، وہ فیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی۔ بازو ننگے لعنت بھیجو لعنت۔"

اور یہ رنگ تو دیکھو بوا، کیسا پھیکا چھی چھی، بھی کیا اب کے سب رنگ

پھیکے۔ سچ پوچھو تو اجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔"

"اونہہ اجلا رنگ! اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو بھی عار نہیں سمجھتیں ابھی سے بڑھیاں بنی پھرتی ہیں، بھلا ان بھتی چھوکریوں کو کہیں اجلا رنگ سجتا ہے۔"

"ان بھتی چھوکریاں کا۔ ارے بابا اب تو غضب ہو گیا غضب! سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں، غضب ہو گیا غضب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کا پاس بھی ہے، انہیں؟"

"اور ہم کچھ کہیں تو یہ موئی لڑکیاں کہیں ہماری باتوں کو پاس خاطر میں لاتی ہیں اللہ کی مار ان پر۔ الٹا ہم سے ٹھٹھا مذاق کرتی ہیں۔ ہم بوڑھیوں سے مذاق۔ ہمارا منہ چڑاتی ہیں۔ اللہ اللہ ان پر کیا کبھی بڑھاپا نہ آئے گا۔"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں.......

"ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں۔ کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں اب دیکھو چٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ، ادھر نکاح پڑھا گیا، ادھر دلہن کی رخصتی ہوئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت۔"

"اور اب کی دلہنیں تو خالہ! آباری چھوریاں۔ توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہ گیا ہے، کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے خصم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سدھ ہو جاتے تھے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ آیا۔"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی۔ اماں! کاہے کو بولوں اس دلہن کی

بے شرمی" اور سب بوڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ماں بیچاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ اوئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی، اس چھوکری کی آنکھوں میں؟ نا بابا ہم سے تو رہا نہ گیا۔ آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے اسے اتنے زور سے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی۔ ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔"

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے شرم کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔" سب یک زبان ہو کر کہتیں۔ اور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے) اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک جملہ نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی

مے سب کی باتیں سنتیں "اب کے جمانے" پر اتنے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرہ سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا...... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

"ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی" "آج کونسی کانی (کہانی) بولوں" اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر ایک میلا سا رومال اپنی سوسی کے "لہنگے" کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں۔ اچھا سنو ایک باچھا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔" پھر ناس پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ اس نے سب شہجادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے سب بولیں "آپ" مگر چھوٹی شہجادی بولی، اور نانی بی اس حیلے سے رومال کو پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہ آتی۔ اور وہ ایک طرف پھر کر پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں۔ چھوٹی شہجادی بولی "ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور حجور آپ کو بھی۔" اس جواب کو سن کر باچھا......

"کیسی چھوٹی شہجادی نانی بھی؟" "مجھ جیسی؟ میں بیچ میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے

میں اٹھالیتیں۔" ہاں بیٹی تمہاری جیسی شہجادی ایسی ہی کھوبصورت شہجادی" میں توش
سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔" ننھی کیسا
پیارا مکھڑا ہے تمہارا   اہا۔ چاند کا ٹکڑا" نانی بی میری بلائیاں لینے لگتیں۔
تٹ، تٹ، نٹ،" دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے"۔
اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں
پر جمی راکھ دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک۔ سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔
پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پہ ذرا سا چونا پھیلا کر۔ پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور
اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی
بولتی جاتی تھیں۔ ناس گھس گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں۔ اور ایک پیاری بڑی
سفید ڈبیا میں۔ بالکل میرے کریم کی ننھی سی ڈبیا کی سی۔ انہیں ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ
سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی دیر سے کہانی سناتی تھیں۔ ایک ایک جملہ مزے ے
لے کر۔ نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے
ایسی جگہ ٹھہرا دیتیں۔ جہاں میرا اشتیاق بڑھا ہوتا۔ ان کی پیک تھوکنے کے بہانے
یا گولیاں بناتے میں بہت ہی منہمک ہوں میں بے تاب ہو جاتی۔
اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہونا"
نا بیٹی جلدی بولوں تو کھاک مجا آئے گا" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان
کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح

بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہزادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر "شہزادی" پر کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہزادہ" آٹپکتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے، اور اس شہزادی کو مصیبت سے نجات دلاکر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہزادی کو بچانے والا۔ میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہزادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہزادہ لیجایئگا؟" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک آجاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہوکر انگریجی پڑھو گی۔ کھوب پڑھ کر بی۔ اے پیاس ہو جاؤگی تو...... اس پہ تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں جرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جایئگا۔ کوئی بہت بڑا ہافیسر۔"

"ہوں، ہوں، بڑا ہافیسر نہیں چاہیئے۔ چھوٹا شہزادہ۔" میں مچلنے لگتی۔

"ہاں ننھی۔ وہ شہزادہ ہی ہوگا۔ میری شہزادی وہ دن کب آئیگا۔ اللہ مجھے اس وکھت تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مرسکوں گی...

......" آہ نانی بی، شہزادہ تمہاری شہزادی کو لینے آگیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی

تمہاری آخری آرزو تھی ــــ کو دیکھ کر فرطِ خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے
حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیاں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں......

ہاں تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔
کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی
تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں، مگر نانی بی کے کہانی بولنے ہی میں اندھیرا ہو جاتا،
اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں
نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور
مچاتے آرہے تھے، تالاب کے پاس آکر وہ بندروالا اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے
تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند
بے فکرے مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے
پاس لے چلو۔" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لیجا کر
ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور
بھی قریب لے چلو نانی بی۔" "نا بیٹی، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اتنے گیر مردوے کھڑے
ہیں۔ اوئی میرے اللہ" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ
لیا۔ "اچھا تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہیں رہونگی۔" میں نانی کی چادر تھامے تماشہ
دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو۔ بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر

حکم دیا۔

بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھالی اور اسے سر پہ رکھ کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ گویا بہت کام کر رہی ہے۔ "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا" بندریا نے زور سے چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی" کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو دو ایک جھٹکے دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔ انہوں نے میری بات سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا ٹکڑا — "کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا!" نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے۔

"آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا"

"ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟" "وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی"۔ "تمہارے گھر والے کون نانی بی" "وہی بجر گوں نے جن سے میرا بیاہ کیا تھا" "تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج

کہانی کے لئے اصرار نہ کرونگی۔"

"میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے جیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی یہی نہیں۔ اچھا آج کانی (کہانی) نہ سنوگی۔ مگر میری جندگی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ! کہتے ہیں پانچ ہزار کھرچ ہوئے تھے پانچ ہزار! برابر ایک مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی۔ گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑی تھی۔ جھومر، مانگ میں موتی، پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پونچیاں، گوٹ اور گوٹوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری "ریشم کی چوڑیاں" اتنی بڑی سی نتھ۔ پاؤں میں چار جوڑی جیور، کان بھر کے سونے کی پتیاں۔ اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اُتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا ریزہ چمکیلا پھر مہندی، کاجل مسی سے سولہ سنگار اور میں ایسی کاہے کو تھی بیٹی"۔ نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا "گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی رونکھ تھی چہرہ پر۔ اب کیا دیکھتی ہو بیٹی بڈھی چمڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس جمانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک باجو یہ موٹا دروازے میں نہ سماتی تھی"..... اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا لال دامنی یہ بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی" نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ "ہرا بنارسی لہنگا اور اطلس کا کرتہ کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں"۔ میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی

سے سُن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنی دیکھ رہی تھی پچکے ہوئے نہیں، "پھولے پھولے گالوں والی" نانی بی کو۔

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے ہی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن، بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ کھرچ کیا۔" ان کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیج مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آئی تھی وہ چیج میرے کھدموں میں۔ کیا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گجرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ لائی تھیں آکھر ایک ہی تو بیٹا تھا۔ جگر کا ٹکڑا۔ میں سیجوں پر بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور 'وہ'، مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے، مجھے گھر کی "پاچھا جادنی" کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیج میرے لیئے لے آتے، کیسے کیسے پر... کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن مسہری پر بیٹھی اپنے دامن میں گوٹا ٹانک رہی تھی۔ پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں" پھر جلد ہی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ چھی چھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ کھیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ "ہاں آنکھیں بند کر دیں۔ اور چیج میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔

اوئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے
آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے بھلے لگتے ہیں
جھومر تمہارے کانوں میں" میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھ تو بڑے
بُرے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لانبے لٹکتے ہوئے "نا بابا مجھے تو کھاک اچھے
نہیں لگتے۔ وہ ہنس کر بولے "تم تو پرانے ڈگر پر چلتی ہو۔ آٹھوں دن رات چار دیواری
میں بند رہتی ہو نا۔ تم کیا جانو۔ جمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا پھیشن
ہے نیا پھیشن" "پھیشن ویشن کیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے۔" کھیر جانے
دو، یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہوں،
چھتر روپے لگے ہیں چھتر" اہا آئینہ! آئینہ کیا کہوں۔ کیسا پیارا تھا۔ کھیر یہ تو ایک
ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی کھوبصورتی کی کیا کھبر ہے۔ کناروں پہ کیسے
کیسے رنگا رنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت کھوش تھی
مگر یونہی گلہ کرنے لگی۔ ارے بھلے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ کھرچ کرتے ہو مجھ پہ۔
تمہیں تو پیسوں کی کھدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ چھتر روپے
بابا" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے "جہرہ تمہیں یوں
کھوش دیکھ کر کھیمت ومیت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہاری کھوسی پہ چھتر روپیہ
تو کیا سب کچھ سدکے ہیں" آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو
یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نانی بی نے آنسو پونچھے، اور دبی آواز میں کہنے لگیں

"آہ اس جمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، چھتّر روپیے دے کر، اتنی دور سے، پرائے ملک سے میرے لئے آیئنہ منگائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آیئنہ تو ان کی یادگارِ محبت ہے۔" اور انہوں نے اس آیئنہ کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا۔ "اور میں کیسے پھخر سے وہ آیئنہ میری سہیلیوں کو بتاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں۔" اری جہرہ تو ٹوٹے بھاگ والی ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے ......

"آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں؛ یہ آسمان کا چکر! یہ جمانا کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا استارہ بھی گردش میں آگیا۔ میری کھسمت ایسی پھوٹی ایسی پھوٹی خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" نانی بی پھر رونے لگیں۔ "میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا۔ "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنی دھن دولت تھی۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وکھت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ وہ تاریپھوں کے پل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادھے آدمی۔ پھولے نہ سماتے اپنی تعریپھ سن کر سب کو سچے دوست جان کر کھوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے برے کی تمیج کرتے اور پھر کھُدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے دروازے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے

لفنگے گنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر
ایک کو بچائے۔ جب پیغمبر کا بیٹا تک خراب ہوگیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ
تو ہر ایک کو کھراب کرتا ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے
کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکہ لگا دیا۔ کھدا ان سب کو گارت کرے۔ میرے
ہیرے ایسے آدمی کو کھراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محبت سے کمائی ہوئی
پونجی مہینوں میں اڑگئی۔ پھر میرے جہیج کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں۔ یہاں
تک تو کھیر تھی۔ جب کچھ نہ رہا، تو کیا کہوں بیٹی!" نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے
لگیں.... تو میرے گہنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو
آتے اور جیور کے لئے تکھا جا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آ
جاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، لکڑی کہیں دیکھ پاتے تو
اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوجھ جاتے اور ان پر نیلے نیلے
نشان ابھر آتے۔ سارے جیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے یہاں تک کہ
میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پھاکوں پھا کے گجار کے میرے
دیدے اندر دھس گئے۔ گلوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات
انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ
سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروا جا کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے
وہیں پر بلایا۔ گئی، تو کیا کہوں بیٹی انہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی

کھینچنے لگے۔ یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاقت لگاتی بہت روئی بھی۔ مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ یوں چند پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی۔ بدن پہ ایک کپڑا نہیں جو کی ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی قسمت پہ رویا کی۔ صبح رسوئی میں ادھر اُدھر سے کچھ کوئلے جمع کرکے انہیں سلگا کر چولھے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آ کھڑا ہوا ہے، کھدایا مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جمین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں، ماد رجاد ننگی، کھدایا! جمین سکھ (شق) ہو جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ آہ! ہم جیسی گنہگاروں کی دعا کہاں کھبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی نیک بی بیوں کا ہی ہکھ تھا۔ اِدھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جمین سکھ ہو گئی۔ کھیر، کیا کرتی، اِدھر اُدھر دیکھا تو ہانڈیاں پکڑنے کا کالکھ سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی گنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمیٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی، پھٹی پھٹی حیران نجروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جبان سے ایک لفج بھی نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ کھبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گجر رہی ہے۔ ہاں ایک دو دپھے میرا بھائی آیا تھا مگر میں کچھ نہ بولی۔ لاکھ کھراب آدمی ہو۔ کتنا ہی ستائے۔ آکھر میرے میاں تھے۔ میں ان کے کھلاپھ کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دپھے کہہ گیا تھا جہرہ کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آ کر۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں

نوکری کی خاطر پرائی بستی جارہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دفعہ تمہیں ضرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار ایسی بے بس، اسے کتنا دکھ پہنچا ہو گا؟ آکھر کسون سے کھون لگا تھا۔" اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور نہ یادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ "رو نہ ننھی، تم کاہے کو روتی ہو ننھی شہزادی۔ اتنا درد ہے میرا بچی کو۔"

"اچھی نانی بی، تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں، ضد نہیں کرتی۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں بیٹی، تمہیں اپنی دکھ بھری کانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے اب تلک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھود گرجی (خود غرضی) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی..... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی

میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ کھیر۔ لو تمہیں بکھی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔"

یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جہرہ' میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی کھدا ہاجر ناجر ہے۔ ان کے کھلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میرے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا۔" لو جہرہ یہ پہن لو" اور آپ دوسری طرف منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیجیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے' کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔ نجریں نیچی کئے بیٹھا رہا۔ کھا چکنے کے بعد آہستہ سے دبی آواج میں بولا' چلو جہرہ گھر چلو' مجھے اس بدماس کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی قسم میں تمہیں پھر اس نالائکھ کے گھر بھیجوں۔ اس جالم کو ہمارے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں پھجیتی (فضیحت) کراؤں گا۔ پھر وہ کچھ نہ بولا۔ کھاموسی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ایسا جرور کرے گا۔ آہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے ان سے پھر ملنے نہ دے گا۔ تانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔" وہ گصتہ میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گصتہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گصتہ نام کو نہیں...... میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے۔

نانی بی نے سرد آہ بھری: "میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بیٹی، بیٹی"
میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ
پھوٹ کر رو رہی تھیں "آہ! کیا کہوں...... بے...... ٹی...... ان کے چہرہ پر پچھتاوا
تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جرور اپنے کیے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں ایک
نئی ساری بھی تھی۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آہی
گیا...... آہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں
انہیں شہدا، لفنگا، بدماس کہا۔ بے سرم کہا۔ بے گیرت کہا۔ میرے اللہ! نہیں کبھی
نہیں، وہ بے گیرت نہ تھے۔ ان میں سریفوں کا خون تھا، میں بھائی کے پاؤں پر
گر پڑی "اللہ واسطے۔ ایسا نہ کہو بھائی۔" اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ
اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموس کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے "میں تمہارے گھر پڑے
رہنے نہیں، جہرہ کو لینے آیا ہوں۔" اب اس کا تم سے کوئی تعلکھ نہیں۔ سرم نہیں
آئی اسے اتنا ستا کر۔ میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا۔ کیا میری بہن اتنی سستی ہے
ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کھسم اگر میری
بہن بھوکوں مرے۔ پر اسے، تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ مار ہی تو دیا اسے
میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

"مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر
راجی ہے تو تمہارا کوئی حکھ نہیں۔ اس پر وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے جرور لیجاؤنگا"

"-ہونہہ! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آجائیگی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی۔"بھائی میں جاؤنگی۔ بھائی مجھے جانے دو" اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نظروں سے دیکھا۔ چپ بے غیرت کہیں کی۔"

"نہیں میں چہرہ ہی سے پوچھوں گا۔ انہوں نے دہلیز پہ قدم رکھتے ہوئے کہا قریب تھا، میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے۔"بے شرم اندر قدم رکھتا ہے؟ ایسا بے شرم نہ ہوتا تو عورت جات کے گہنے بیچتا۔ کیا پوچھتا ہے چہرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے۔ میں اس ظالم کے ساتھ نہ جاؤنگی، آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا..... کیسا جھوٹ بولا۔" اگر تجھ میں ذرا بھی غیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا۔ پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا۔" پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پہ کھڑے تھے۔ آہ بیٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا..... ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے غیرت والے تھے بیٹی۔ اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پہ آتے؟..... آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موقعہ پا کر رات وہاں سے چلی آئی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی۔ بیٹی، تو نوکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں قدم نہ رکھا..... میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری غیرت کیسے قبول کرتی کہ وہاں

پڑی رہوں مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کولی، مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے
ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا۔ جو ان پر بند ہوا
تھا...... اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج
دیتے۔ انہیں بیٹی کا لاکھ درد سہی۔ وہ بیاں کا درجہ پہچانتے تھے۔ کہا کرتے۔ عورت
کا مکھام سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے ہوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو جرور بھیج دیتے
...... سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے
اور مجھے تو ایسا معلوم پڑتا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے
پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی! ایک دو دن تکلیف سہہ ہی لیتی۔ اور پھر وہ
مارتے تھے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا
تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجے ہوئے حصّوں پہ ہاتھ نہ پھیرا
کرتے۔ پھر ایک دو دھبے تو انھوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان
دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نجروں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی
او کھدا! کھدایا!! ان کی ایسی ایک نجر ہی بس تھی ...... ایک نجر ہی بس تھی" نانی بی
پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس
کے اندر بھونچال آ گیا ہو۔ کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ
آہستہ تھما کہنے لگیں۔

" اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ سراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت

پھر شتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ غیر عورت کی طرف کبھی نجر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گُن ہو۔ یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی۔"

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی "نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا" اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی۔

"نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھاتی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا؟ کیسا خراب آدمی۔ تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟"

"نپھرت بیٹی؟ اس کی صورت سے نپھرت" کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان!! گٹھا ہوا بدن، چوڑا چکلا سینہ۔ اور صورت کا تو کیا کہنا چوڑی صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا، جب اُجلے اُجلے کپڑے پہنے، لال کشمیری دوشالہ کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے یہ دو آنکھ بس نہیں تھے۔ میں جلدی جلدی لال پیلا پانی لے آتی اور دیوڑھی کے باہر قدم رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے

مکھڑے کو نظر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے نصرت بیٹی! وہ تو بالکل اچھا ہوں گا باچھا تھا۔ شہزادوں کا شہزادہ!!"

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوادوں سب سامان آگیا ہے، تم آؤ نا خیرون بی کی کچھ مدد کرو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کرلو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں۔"

"نہیں امی آج پارٹی نہیں دونگی۔"

"کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ۔"

"اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے"

"ہونہہ۔" امی زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی۔"

"امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر وہی نانی بی! سچ مچ اس بوڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا۔"

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں

انگڑائی

"آپا، گلناں آپا! وہ دیکھو مچھ فنا... ..." جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

"ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا..... دیکھ تو میری ساری کا ناس کئے دے رہا ہے۔ سفید ساری کل ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!" میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی "نہیں تو آپا..... مچھ فنا پچھ ہما سے لے لو ڈپل....." اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلاؤ نا..... مچھ فنا پچھ کتنی اچھی ہیں۔ اُچھ دن مجھے کیک دیا تھا دل کو کو..... کیسی اچھی کو کو..... آپا انہیں بلالو اچھی آپا۔"

"ارے!" میں چونک پڑی "مس فنانس یہاں!" میں نے دریچہ کی طرف

نگاہ ڈالی، ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ "تو انہیں بلالوں؟" میں نے سوچا۔ پھر جلدی سے کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کئے کونے میں پڑی ہے۔ تو ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو۔ اور صوفہ! ہونہہ، یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی۔۔۔۔ ٹیبل کلاتھ؟ اس پہ تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں۔ اور سیاہی کے برتنے میں تو بڑی فیاضی دکھائی ہے۔ میرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقہ کی ہے؟ اف کس بدتمیز نے فرش پہ کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہ! ۔۔۔ یہ کریمن بھی کہاں مر گئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔

"کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا! کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لئے جمع کر رکھی ہے؟" "آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتار لوں، جل جائیگی" بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولہے میں گھسی رہتی ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔ آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی۔ بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اسی کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش

پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پہ نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں! "زکیہ! زبیدہ!" میں حلق پھاڑ چلائی، جواب ندارد! دروازے میں جاکر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود! زکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زکیہ! کچھ مدد بھی کرو گی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔" "خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونہی آج"...... پھر وہ میرے پھولے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ "اخاہ، آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارہ سو ڈگری پر چڑھا ہوا ہے۔ اہاہا، ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھونا، ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔" منہ بنا کر تالی بجاتے ہوئے۔ "بتا دوں آپا؟...... او...... اوں...... مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں!"

"یہ تو سب معلوم ہی ہے، اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو، تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟" اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

زکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنّا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے۔

"ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے؟" میں نے جھنجھلا کر سمیٹے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

"کیا کہہ رہی ہو آپا؟" زکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کئے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔ "زبیدہ! آجاؤ اندر"

"کیوں آپا؟" زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"آجاؤ! اگر مس فنانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی۔" میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو اور اچھا ہوگا، وہ کیوں نہ آئیں آپا؟"

"گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے!" "ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے انہیں آنے دو آپا!" دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

"کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے۔"

"اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا آخر تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں، ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!......تم انہیں نہ بلاؤ آپا تم تو مس فنانس پر" زکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکایک زور سے ہنس پڑی۔ اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "ہوں! اچھا میں جان گئی......

جب سے پرویز بھیّا......"

ارری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے" میں نے زور سے اس کے ایک چٹکی لی۔

"ہونہہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں" میں یونہی شرماتی لجاتی، سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے! — پرویز!

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں، پردہ ہوا سے اُڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا وہ مسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

"یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟" میں زکیہ کو جھنجھوڑنے لگی "اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آ رہی ہیں" میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور زکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لئے ہوئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ "گلنار کو بلا دو نا" مس فنانس کہہ رہی تھیں، اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا، اور مسکرا کر آواز دی "گلنار!" میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی...... میرے یوں شرما جانے

سے وہ کیا سمجھی ہونگی ؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب ..... مگر انہیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی گو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے ! رفتہ رفتہ میں اُن سے کھل کر بات کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی اُن سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھئے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے ! چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر میں جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا ! ہاں میں ان پر مرتی تھی انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں کیسے مجھے تنگ کرتی تھیں "گلنار ! نہ جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو وہ کونسی ایسی حسین ہیں کہ بلکہ انہیں بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔" جی چاہتا ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔ انہیں کیا معلوم کہ و. مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں ! دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن خفا ہو کر روٹھ گئی تھی گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اس دن میں نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور پہ بھاسے سادہ مانگ کر سیاہ "بوٹو" بھی لگایا تھا۔ میں اور زرینہ ہاسٹل کے کاپیونڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی " اہا۔ آج تو تم بلا کی حسین نظر آرہی ہو گلنار ! " "مس فنانس کی سی ؟ " میرے منہ سے بے اختیار

نکل گیا تھا۔ ہونہہ! مس فنانس!" زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ "مس فنانس! وہ تین دفعہ مرکر جنم لیں تو شاید تمہارا حسن انہیں نصیب ہو!" مجھے کتنا غصہ آیا تھا اس پر! روٹھ گئی گل؟ اچھا بھئی وہ تجھ سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں! خوش ہوگئی اب تو؟" پھر وہ قہقہہ پہ قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندر ابھی مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں آخر وہ کون ہوتی ہے مس فنانس کی توہین کرنے والی! یہاں میرا جی جل رہا ہے اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی ہے! اگر ایک بات بھی ان کے خلاف کہی جاتی تو میں زرینہ سے تو کیا کالج بھر کی لڑکیوں سے لڑنے کے لیے تیار تھی۔ بھلا میں ایک ہی تھی کتنی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو بہت سی لڑکیاں انہیں چاہتی تھیں للیتا نہیب لڑکی وہ تو مجھی کو ان کی محبت کا حق دار سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتی بلکہ مس فنانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی! اس کے برخلاف وہ لکشمی! حسد کی پتلی! کیا کیا جتن نہ کرتی تھی کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اس پر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساریاں اور انہیں کس سلیقہ سے پہننے کی کوشش کرتی۔ چھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی اور بعد میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بھی بنا لیا تھا، ہونہہ۔ ان سب جتنوں سے کیا ہوتا وہ حسین تو تھی نہیں مس فنانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی۔ مس فنانس کے خاص سبجکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی! مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لیتے

تھے؟ آخر کچھ بن نہ پڑتا تو مجھ سے خوب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی۔ کہا کرتی ”ہونہہ! سرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد اور چھریرا بدن تو حسن کے ضروری جزو ہیں“ وہ خود بھی گوری تو تھی لیکن تھی دراز قد اور دبلی پتلی مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فراز، نہ کوئی لچک، نہ کوئی ادا، چپٹی بے جان لکڑی! جی چاہتا منہ توڑ جواب دوں ”ہونہہ! خوبصورتی کے لئے دلکش نقش تیبسح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں اور بھرا ہوا گول بدن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش“۔ مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی کی گوری رنگت والی لڑکی کو دکھا کر کہتی، ”دیکھو گلنار وہ لڑکی کیسی حسین ہے۔“ اور اسکی بتائی ہوئی لڑکی، اتنی بد صورت، اتنی کہ بہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بے حد موٹے ہونٹ، بھدا جسم، مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی ”تمہاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں“ جب ان باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اتر آتی اور بار بار مجھے ”کالی“ کہتی حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصہ گندمی تھا...... اور زینت وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی کیسی سادگی

سے شکایت کرتی تھی۔ "گلنار! مس فنانس تو تمہیں کو زیادہ چاہتی ہیں" اور وہ بیحد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت...... وہ بھی تو انہیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی اور تلملیتی.......

"گلنار بی بی!"

"کیا ہے کریمن؟"

"بیگم نے میٹھے ٹکڑے، اور سموسے بنانے کے لئے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحب آئی ہیں نا!

بہت کام ہے بی بی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے تو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔"

میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس ادھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح صاف کر کے روٹی کاٹنے بیٹھ گئی۔ کریمن نے گلا ہوا قیمہ چولھے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی...... تو یہ میٹھے ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ میٹھے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انہیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ میرے کالج میں پروفیسر تھیں اور جب ان کا

ٹرانسفر ہوا تھا تو میں کتنا روئی تھی! وہ منا رہی تھیں، تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی..... پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے اسی جگہ بھیجنے پر رضامند کر لیا جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گذر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش اس کالج میں ایم۔ اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو اور سال ان کے ساتھ رہ سکتی!..... پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لئے جو جماعت میں ہمیشہ اوّل آیا کرتی ہو، فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں ــــ میں کانوکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی۔ سب لڑکیوں میں اوّل آنا تو میرا معمول تھا اس کے الگ تمغے ملیں گے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اوّل رہونگی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور کالج کا نام کیسے چمکے گا ــ ان کی امیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پروا نہ تھی۔

آخر وہ دن آگیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر جب ہاسٹل لوٹی تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اتنا کہ آنکھیں سرخ ہوگئیں اور تکیہ کا غلاف بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگا لیا اور تسلی

دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی...... اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں۔ نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں کیتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ !.......

"تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹی؟ ادھر لاؤ انہیں میں گھی میں بھون دوں اور اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنا لینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کا حکم دیا۔ کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام بن نہیں پڑتا۔ ورنہ میں تمہیں کام کرنے کو کہتی، توبہ توبہ اس بوڑھے منہ میں کیڑے نہ پڑ جائیں یہ نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، ان کو میں، موئی نوکرانی، کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جائیں!" بوڑھی کرین خوشامد کرنے لگی، میں بغیر جواب دیئے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

...... وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار انھوں نے مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی "صرف ایک بار آجاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھما لاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی" میں نے بصد ناز ان کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا...... اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں، اسی پچاسی فی صدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں، کہا کرتیں، آخر تم تو

ان کی فیوریٹ ہونا! ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر"...... میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسّم کتنا محبّت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس فنانس کی بجائے "اینجلنا" کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں۔ "میری اینجلنا"۔ مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکہ حسن، میری آسمانی اینجلنا، اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی میں تو! اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے بھی تو ایک دن......

اس دن میں اور للتا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ میں بیٹھی تھیں۔ باتوں میں للتا نے پوچھا تھا۔ "مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟" "نہیں" انہوں نے جواب دیا۔ "مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے۔ اور اس کے لئے رائڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔" اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "کوٹ اور پتلون گلنار!" اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ "میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہونگی نا؟" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں، وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کرہی ہوتیں مگر نظر

مجھی پہ جچی ہوتی اور نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔شاید ساری کی عکس کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سنہری ہو جاتا اور رخساروں پہ ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی ...... اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے ......

میں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انہیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے! اتنی دیر چولھے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، ساری کے آنچل سے انہیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں مس فنانس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پہ جادو سا کر دیتی تھی۔ اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کو تیار تھی۔ دفعتاً میری نظر ساری پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور جاوید کے ہاتھوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ میں یہ ساری پہن کر کیسے جا سکوں گی؟ اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

"زبیدہ!" میں نے آواز دی۔ توجہ کئے بغیر بھاگی جا رہی تھی۔ "زبیدہ ادھر تو آؤ!"

"ہونہہ! نہیں آؤنگی مجھے مس فنانس کے پاس جانا چاہیئے۔"

"میری اچھی منّی مان لے گی اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دونگی منّی کو!"

"کیا ہے آپا؟" چاکلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اچھی منی! مجھے الماری میں سے ایک ساری لادو نا! دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے
مس فنانس کے پاس یہ پہن کر کیسے جاؤں۔ یہ لو الماری کی کنجیاں!"

"ہاں آپا، جلدی جاؤ مس فنانس بار بار تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"

...... تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعہ انہیں خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پا کر کیسے خوش ہو گئی تھیں...... اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیئے بغیر اچانک اس کالج میں آ گئی تھی جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی جہاں سے میں تو انہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیجا تھا کہ انہیں اطلاع کر دے میں اس کالج میں داخلے کے لئے آئی ہوں۔ انہوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا "گلنار! گلنار! گلنار! یہاں! سچ کہو" لڑکی نے انہیں یقین دلایا "وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟" لڑکی انہیں بتا رہی تھی میں کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر "گلنار، گلنار، تم کہاں ہو؟" کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا ہی مزہ آیا تھا......

"لو اللہ اللہ کر کے سب چیزیں تیار ہو گئیں اب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں......"

کم بخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

"خدا بھلا کرے گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔" کریمن باورچی خانہ میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ "اہا بیٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہو گی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی تمہارے لئے کتنی ہی دعائیں میرے منہ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا، پر نا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے لونڈے تک مجھے ڈانٹ بتاتے تھے۔ میری بی بی نے تو اب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لئے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی۔ صرف تمہاری شادی کی خبر سن کر آئی۔ تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔"

بھلا پرویز سے اچھا دولہا بھی کوئی ہو گا؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آگئی میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو۔ اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز! —— اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا ہاں نہایت حسین، کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا "تمہارے شوہر کو تم سے بیحد محبت ہو گی"۔ تو مجھے اپنے اس ہونے والے

شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکونگی اور اب ؟ . . . .
اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہوں گی۔

"آپا ساری لے لو" میں نے زبیدہ سے ساری لے کر میز پر رکھ دی، اور بال بنانے لگی۔

آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا سکی ؟ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ہونہہ! چاہتی ہونگی۔ کبھی انہوں نے زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا ؟ میں ساتھ ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔ "گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی ؟ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لوں تو ؟"

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں کیا ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ڈریں اُف رے بزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں۔ مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کئے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے سے بھی میرا نام لیا تھا . . . . . مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں . . . . . ہونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی ؟ میں تو ہر پرچہ میں اول آتی تھی . . . . لیکن کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھیں۔ مس فنانس تو اسّی بچاسی دے دیتی تھیں . . . . . ہونہہ! صرف زیادہ نمبر دے دیئے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں۔ دیکھو گلنار نے

کتنے نمبر لئے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لئے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر، ہیں تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہ گئی تھی اور وہ مس جونس تھیں آکسفورڈ کی ایم۔ اے، وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل! سروجنی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں "ماشاءاللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا۔" وہ دوسری ٹیچرس اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملا بائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے! فقط تھیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں۔ ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں۔ "گلنار! تم کتنی حسین ہو!" کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے "آج تو تم بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو گلنار! یا یہی سہی" "یہ ساری تو تمہیں بہت سجتی ہے۔" میں اس کے لئے کتنے ہی جتن کرتی تھی جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ چوڑیاں پہنتی اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے

ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آپڑیں۔ اور مس فنانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکے....... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آرہی ہوں ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی....... اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسّمہ تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟ مانا بھی کہ وہ پروفیسر تھیں مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں۔ کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیابو میں حصّہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکۂ نورجہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک اپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں "گلنار! نورجہاں کی تمثیل کے لئے تم ہی موزوں ہو۔" "تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو۔ مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟" پوڈر لپ اسٹک روج لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "اب آنکھیں اوپر اٹھاؤ ان کا میک اپ بھی کر دوں۔" اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو واللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!"...... اور کس شدّت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں! آخر میں مسز سوشیل کو

ہی کیوں نہ چاہتی تھی؟ مس فنانس میں کونسے سرخاب کے پر لگے تھے؟........
اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھی! اور رلنا! وہ تو اشعار
لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پہ! زینی بھی کہا کرتی تھی نا۔ "گلنار، تم چشمہ نہ پہنا کرو۔
یہ تمہاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔" سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اسی لئے تو میں
اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور ان کی کلاس
میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں مجھے
بہت دقت ہوتی۔ ہونہہ! اس بے حس پہ کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی
حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار
کہہ اٹھیں گے۔ "تمہاری آنکھیں، غزالی آنکھیں، کتنی سیاہ! کیسی مدھ بھری!!"
.... کالج ڈے میں نے صرف اس لئے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں "سینٹ جون "Saint
(Joan کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا
گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آگئی۔
جون، ایک دیہاتی لڑکی، پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت
وہ بنی سنوری ہو گی۔ لیکن یہاں کے فلموں اور سٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا
ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ کرے وہ خوبصورت ہو اور اسے اچھی طرح سنوارا
جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انہوں نے میرا ٹھیک
ہی میک اپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائڈنگ سوٹ مجھے پہنایا

تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون۔ اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیئے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی پر اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیئے گئے تھے۔ غلطی تو ویدیہی کی تھی جس نے ڈیوک آف وارک کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ سٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ "ہائے گلنار! یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو' نہ روز نہ لپ سٹک!" اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ سٹک لگا دیا اور گالوں پر روژ مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے روکھے بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا مس فنانس آج میری تعریف ضرور کریں گی۔ بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مسز شوبل مس جونس' مسز ڈیانیل' دوڑی ہوئی سٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آکر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس؟ انہوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو

پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں۔ لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں "گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا، واہ رے تمہارا کام!
تاہم انہوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہوگئی تھی گو ہاسٹل کالج ہی کے کامپاؤنڈ میں تھی۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں۔ گلنار! تم نے تو کمال ہی کر دیا، تمہاری اداکاری کے کیا کہنے" "تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آرہی تھیں گلنار! ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "میری اچھی گلنار، تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرونا۔ آج تو تم پری معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی، جون کے لئے تمہارا میک اپ ٹھیک نہ تھا۔ انکوزیٹر (Inquisitor) کہہ رہا تھا۔ "Joan, you look Very pale today." اور تمہارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی!" ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبھوں نے تعریفوں کی بوچھار کر دی۔ اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی ہونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میں اپنی مس فنانس اپنی اینجلنا سے ملوں گی تو وہ یہ کہیں گی۔ یوں تعریف کریں گی...... دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کو لئے ہوئے گئی تو اپنی اینجلنا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری

چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں ...... زرینہ سچ کہتی تھی ,,گلنار تم اتنی رومانوی لڑکی اور
مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمہارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ
برف ...... ہاں وہ ضرور جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ بے حس اور مردہ دل۔
پتھر کا مجسمہ برف کا تودہ! بھلا پرویز سے ان کی کیا مناسبت؟ میرے پرویز کی
رگ رگ میں زندگی ہے، بجلی ہے۔ تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے
اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا نا! جب ابّا نے
انہیں سلامی دینے (نذرانہ پیش کرنے کے لئے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی
زرینہ آئی ہوئی تھی اور جبین بھی ,,دولھا بھائی آگئے'' زبیدہ کی آواز آئی اور میرا
دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے
بھی گھسیٹنے لگی۔ اٹھو گلنار! تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لو نا'' میں پہلے تو جھجکی۔ گو میرا
جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں'' امّی کیا کہیں گی؟'' ارے
امّی کی بچی اُٹھ۔ ایسا زرّیں موقع کھو دے گی'' زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ
ابّا کے سامنے کیسے شرمائے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم
نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کمبخت سوراخ کتنے
چھوٹے تھے! آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی
گل کر دی تاکہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول
کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر

میں جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی......

"بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!" زرینہ نے فرطِ مسرت سے گلے لگالیا۔ میں نے شرما کر آنکھیں جھکالیں۔ "میری گل! ایسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اس کا" وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی تھی!...... وہ پھر چہکنے لگی۔ فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ اِدھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کی امی سے ڈرنے والی" زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ "دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ خدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو!"...... ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرہ کو، ان تبسم آمیز ہونٹوں کو، ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری تھی...... اری بڑا رومیانٹک معلوم ہوتا ہے گل! تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے تو میرے ذمہ! ابھی سے کہے دیتی ہوں گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا، گلے کا ہار بنائے گا" اور میں دفورِ جذبات سے جھکی جا رہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں گر پڑی ......"دیوانی، مس فنانس پر مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں اس پتھر کی سی بے حس عورت سے۔ مسرت ہو یا رنج، غصہ ہو یا بے تابی، وہی پھیکا چہرہ، وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھ کتنا ایکسپریشن ہے اس کے چہرہ پر، گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں"...... ہاں وہ اس وقت مجسم انبساط نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ کیوں؟ شاید اس لیے

کہ کہیں میں نظر آ جاؤں ؟

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑی ہو جاؤں...... کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی، ایک لمحہ کے لئے پردہ کھسک جاتا اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے۔ میں اس نیلی جارجیٹ کی نقرئی بارڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آ رہی تھی نا...... ہونہہ! میں یہ ساری کیوں پہن کر جاؤں۔ میں جارجیٹ کی ساری بہنوں گی جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ میں نے ساری کھینچ کر پھینک دی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی۔ اور زکیہ کو آواز دی۔ ذکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی۔ ذکیہ، ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجیٹ کی۔" "اچھا لے آؤنگی مگر تم جلد آنا امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مس فنانس کے ساتھ کھانے پر نہیں بیٹھیں گی۔ ان کی بجائے تم بیٹھو تو بہتر ہے۔"

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی۔ مس فنانس ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں، بے حد پتلے، پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں، گہرے ہو رہے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں، ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی تھی! میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر مٹ جائے۔ اس کی جگہ دماغ کے پردہ پر

ایک اور تصویر ابھرنے لگی۔ پرویز کی! وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی، نشیلی، لانبی خمیدہ پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی، اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پہ وہ ہلکا سا خم گویا وہ مسکرانے کے لئے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر! ہاں میرے شیام اور میں رادھا! میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھالی، پرویز کی، اور فرطِ بے تابی سے اسے چوم لیا۔ "یہی ساری نا؟" میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ ذکیہ ساری لئے کھڑی تھی۔ "ہاں یہی" "آپا جلدی آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہاں ساریوں پہ ساریاں بدلی جا رہی ہیں۔ ادھر یہ سب بے پروائی اور ادھر دیکھو تو بے چاری مس فانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

"اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اٹھالی۔ اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصور میں کھو گئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر پہلے ان ہونٹوں پر ہی جا جمتی تھی۔ یہ ہونٹ اور ــــ اُف کیا خیال آ گیا۔ میں مارے شرم کے غرق غرق ہو گئی۔ میں نے تصویر رکھ دی اور ساری پہننے لگی...... ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی! اُف کس بلا کا سجیلا پن! گٹھا ہوا بدن، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، لانبے مضبوط بازو۔ ان بازوؤں میں...... اُف پھر کیسے خیال آ رہے تھے...... جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں، دل کی دھڑکن کیسی تیز ہو رہی تھی! اور خون جیسے اُبلا جا رہا ہو۔ نس نس میں گرمی، آگ، اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان! میں

بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منہ چھپا لیا۔ یہ ہیجان، کیسی لذت تھی اس میں!

"گلنار آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ "مس فنانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا۔ اور وہ تو تمہاری استانی ہیں۔" امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

"تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔" "تمہیں کو یاد کر رہی ہیں۔" "تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔" اچھا ابھی جاؤں گی...... ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور جاؤنگی۔ یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے۔ اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنونگی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی۔ کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری ینگیجمنٹ رنگ 'P-Engagement Ring پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیئے دے رہی تھی۔ اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤنگی۔ اور انہیں بتا دونگی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہونگی کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منہ بسورائے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤنگی، درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کرونگی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونہہ! میں انہیں کیسے حیران کر دوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی: "کیسی خوبصورت ساری ہے" اور میں بڑے

فخر سے کہونگی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کرونگی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔ انہیں میری شادی میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کرونگی اور ــــ جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی جلیں گی؟ ...... ضرور۔ اس وقت جب میں چھٹی لئے بغیر گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا۔ "گلنار! کہیں تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔ "نہیں" انہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ "تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!" اور جبھی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارکباد تک نہ لکھ بھیجی تھی۔..... اور اب تو میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اٹھیں گی۔ ہونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

گھنیری بدلیوں میں —

وہ بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرہ پر ایک ملکوتی حسن جھلک رہا تھا۔
وہ مخصوص حسن جو صرف ماتاہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ اداس سی بچے پر جھکی ہوئی،
وہ میڈونا نظر آرہی تھی۔ مقدس مریم کی اس تصویر کی مانند جس میں وہ یسوع مسیح کو
گود میں اٹھائے ماتابھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ کتنی خوبصورت
ہیں بچے کی آنکھیں۔ بالکل اپنے باپ کی سی، بڑی بڑی بادام کی سی، اور یہ لانبی
لانبی پلکیں، اسے کتنی خواہش تھی کہ بچے کی آنکھیں ایسی ہی ہوں۔ ان دنوں جب
وہ امید سے تھی، تو اپنے شوہر کی آنکھوں کو ہمیشہ تکا کرتی تھی۔ اور آئینہ میں دیکھتے ہوئے
اپنی آنکھوں کو زیادہ توجہ سے نہ دیکھا کرتی، اس خوف سے کہ کہیں بچہ کی آنکھیں
اس کی آنکھوں سے مشابہ نہ ہوجائیں گو اس کی اپنی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں

کالی رسیلی آنکھیں جن میں ستاروں کی سی چمک بھی تھی اور خاموش نیلے سمندر کی سی گہرائی بھی۔ مگر اس کے شوہر کی آنکھیں کچھ اور ہی طرح سے حسین تھیں۔ بڑی بڑی بادام کی سی نیلی آنکھیں اور لانبی اوپر کو مڑی ہوئی پلکیں دونوں کی آنکھیں خوبصورت تھیں لیکن وہ چاہتی تھی کہ بچے کی آنکھیں اس کے شوہر کی سی ہوں ـــــ لانبی پلکوں کی جھالریں دو چھلکتے ہوئے جام۔ وہ ان آنکھوں کو اس وقت بھی تکا کرتی تھی جب وہ اس پہ محبت کی کرنیں برسا رہی ہوتیں۔ اس وقت جب وہ نشہ سے بوجھل ہو جائیں۔ اس وقت بھی جب وہ آنکھیں نیند کے غلبہ سے بند ہوئی جاتیں۔ اور لانبی پلکیں اس کے خوبصورت رخساروں پہ کانپ رہی ہوتیں۔ اس وقت بھی جب وہ بند ہو جاتیں ـــ بادام کی سی آنکھیں اور رخساروں پہ جمی ہوئی وہ ریشمیں پلکیں۔ وہ چاہتی تھی کہ بچے کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں۔ باپ کی سی! لڑکی کے دل میں اس کی یاد پھر ٹیس بن کے اٹھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ آج تو وہ چند لمحے بھی اس کے ساتھ نہ گذار سکی تھی۔ صبح اٹھتے ہی وہ تھوڑا سا ناشتہ کر کے آفس چلا گیا تھا۔ پھر جب وہ پانچ بجے لوٹا تو دوست پیچھے لگے تھے۔ یہ دوست آشنا بھی کیا بلا ہوتے ہیں جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ لڑکی کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ کبھی کبھی تو شام ہی سے آدھمکتے ہیں اور آدھی آدھی رات تک بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ پھر وہ کوئی ایسے گہرے دوست تو نہ تھے یونہی اس سے بحث کرنے آیا کرتے تھے بھلا اس کے

شوہر سے کہیں بازی لے جا سکتے تھے؟ کتنا اعلیٰ ذوق تھا اس کے شوہر کا! لڑکی کے دل میں فخر و محبت کے جذبات امڈ آئے۔ کیا ان لوگوں کو اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کتنے بے چین ہوں گے۔ شاید ان لوگوں کے سینے میں دل ہی نہیں۔ اگر ہوتے تو کم از کم انہیں اتنا تو احساس ہوتا کہ وہ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج بھی جب وہ اس کی آواز سن کر بھاگی بھاگی دروازہ کھولنے گئی تھی تو اسے یہ دیکھ کر کتنا غصہ آیا تھا کہ دو تین دوست بھی ساتھ ہیں۔ دن بھر کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی وہ اس سے نہ مل سکی تھی۔ اُف آج وہ کتنا ترس گئی تھی لمحہ بھر کے ساتھ کے لئے۔ خیر یہ دوست تو سات بجے ہی چلے گئے تھے۔ اب تو وہ اس کے پاس بیٹھ سکے گی۔ لیکن اسی وقت بچہ رونے لگا تھا اور اسے بچہ پر غصّہ آ گیا تھا۔ ہاں اس ننھے سے یک ماہی بچے پر بھی۔ نہ جانے ان عورتوں کے دل کیسے ہوتے ہیں۔ جو بچوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہیں۔ ایک بچہ ہو جائے تو شوہر کی محبت کم ہو جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسے تو اپنے شوہر ہی سے محبّت رہے گی۔ ماتا ہرگز اس محبت کی برابری نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے بچہ سے بھی اس لئے محبّت تھی کہ وہ اس کا بچہ تھا۔ اس کے اپنے جمیل کا۔ جب جمیل ہنگھوڑے پر جھکا ہوا محبت سے بچہ کو کھلا رہا ہوتا تو اس کا دل مسرّت سے معمور ہو جاتا تھا۔ ہاں اسے بچہ کو سلا کر جمیل کے پاس گئی تھی۔ تب کسی نے آ کر جمیل کو آواز دی اور اسے بلا کر کہا۔ فلاں کے ہاں تمہاری دعوت ہے۔ وہ ٹال رہا تھا۔ "دیکھئے آج میری طبیعت کچھ خراب ہے

لیکن وہ آدمی اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا... اور وہ! اس کا دل درد کے بوجھ تلے دبا ہوا! وہ آج ہی نہیں کئی دنوں سے یہ درد محسوس کر رہی تھی جب سے وہ کورٹ جانے لگا تھا۔ لیکن یہ کیوں؟ آخر سبھی عورتوں کے شوہر دن بھر کام پر چلے جاتے ہیں۔ وہ یوں نہیں تڑپتی رہتیں۔ عجیب لڑکی ہے وہ بھی! لیکن ایک ماہ پہلے ان کی زندگی کیسی حسین تھی۔ وہ جانتی بھی نہ تھی کہ جدائی کیسی ہوتی ہے۔ وہ دن بھر ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، زندگی کا ہر لمحہ حسین نظر آتا تھا۔ اس کے لیے آنے والی گھڑی میں مسرت پنہاں تھی اس کے لانبے مضبوط بازوؤں میں بھنچی ہوئی، جب اس پر جھکی ہوئی ان حسین آنکھوں میں امرت ہی امرت چھلک رہا ہوتا جب ان نگاہوں میں محبت کی وہ گرمی ہوتی کہ وہ اس کی تاب نہ لاکر آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں میچ لیتی۔ وہ محسوس کرتی کہ فردوس میں جا پہنچی ہے یا کوئی حسین سپنا دیکھ رہی ہے۔ اسے اس سے زیادہ مسرت مل ہی نہیں سکتی۔ وہ فرطِ مسرت سے دیوانی ہو جائیگی...... لیکن اب اس کے ساتھ رہ کر بھی وہ گویا اس سے دور تھی۔ دن بھر تو اسے کورٹ میں رہنا پڑتا۔ لوٹتے ہی مطالعہ میں مصروف ہو جاتا۔ پھر آفس سے لائے ہوئے مقدموں کے فائل بھی دیکھنے ہوتے تھے۔ کاش وہ ان کی شادی کے چند دنوں بعد ہی پریکٹس شروع کر دیتا۔ وہ کم از کم اس تنہائی کی عادی تو ہو جاتی۔ لیکن انہوں نے پورا ایک سال دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد رہ کر گذارا تھا اپنی رومان کی بستی میں۔ انہیں زمینوں سے

کافی آمدنی ہوتی تھی لیکن جمیل کہا کرتا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے اس کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں سوسائٹی کا ایک بیکار عضو ہوں۔ پھر اس کے اشتراکی اصول "یہ آمدنی تو غریب مزدوروں کے پسینے کی کمائی ہے۔ جب تک میں اپنی محنت سے نہ کماؤں چین نہیں آتا۔ میں نے گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال بھی مختار پر چھوڑ رکھی ہے۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔" اور اس نے پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وکالت نے اس سے جمیل کو چھین لیا ہے۔ اس کی زندگی سے ساری رنگینی نچوڑ لی ہے کیا اب دن یونہی بیتتے جائیں گے؟ وہ پھر مسرت نہ دیکھ سکے گی۔ بچہ اس کی گود میں ہلا۔ اس کی بھنچی ہوئی ننھی سی مٹھی گال پر سے کھسک کر لڑکی کی گود میں آ گری لڑکی نے جھک کر بچے کا منہ چوم لیا۔ "میرے ننھے اب تم ہی میرے لئے خوشی کی ایک کرن ہو۔ وہ رقت بھری آواز میں بولی۔ بچے نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ لڑکی کے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یکایک بچے نے منہ بنایا جیسے اُسے تکلیف ہو رہی ہے اور درد سے چیخنے لگا۔ "میرے اللہ میرا بچہ بیمار ہے!" اس نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سسکیاں جو نہ جانے کتنے دنوں سے اس کے گلے میں گھٹی ہوئی تھیں اُبل پڑیں۔ وہ آنسو جنہیں وہ اب تک پی کر رہ گئی تھی ایک طوفان بن کر بہ نکلے۔ وہ اٹھی بچہ کو گرائپ واٹر پلایا اور آہستہ آہستہ اس کا پیٹ دبانے لگی لیکن بچہ برابر

چیختا جا رہا تھا۔ "میرے ننھے تو تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تجھے کیا درد ہے۔ میرے بچے کا سارا درد مجھے دیدے الٰہی۔ یہ ننھی سی جان اسے سہہ نہیں سکتی" لڑکی نے اپنی پُرنم آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ بچہ کو بیچ بیچ کر سسکیاں لینے لگی...... بچہ اس کے سینہ سے لگ کر سو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے زانو پر لٹا لیا۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں اس کی خوبصورت آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آئی تھیں۔ ٹن کی آواز آئی۔ لڑکی نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اب جلد ہی وہ آجائے گا۔

اس کے کانوں میں وہ مانوس آواز آئی۔ وہ پیاری آواز۔ اسے جمیل کی آواز سے بھی کتنی محبت تھی۔ جب کبھی وہ باہر سے آکر دروازہ کھولنے کے لئے آواز دیتا۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ لیکن آج وہ اتنی خوش نہ ہو سکی۔ اس کے دل کو اس پیہم کسک نے اتنا مسل دیا تھا کہ وہ کھل ہی نہ سکتا تھا۔ اس کی خوشی اتنی دھیمی تھی۔ جیسے کہیں دور گھنیرے بادل کی تہوں میں بجلی کی چمک دکھائی دے۔ اس کے دل پر غم کی ایسی ہی تہیں جمی تھیں۔ اس نے آنسو خشک کئے۔ بچے کو پنگھوڑے میں سلایا۔ جلدی سے آئینہ لیکر صورت دیکھی اور دروازہ کھولنے چلی۔ لیکن جمیل کے بھائی کو بھی ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی اور دروازہ کھولنے کے لئے لڑکے سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سر کو پیچھے جھٹکا دے کر آنکھیں میچ تصور کرنے لگی۔ جمیل کے کمرے میں آتے ہی وہ اس سے لپٹ جائیگی۔ دن بھر کے

صبر آزما انتظار کے بعد آخر کار وہ چٹخنی کھولنے کے لئے بڑھی۔ لیکن اسے ایک شرارت سوجھی۔ نہیں، جب وہ آئیگا تو وہ اس کمرے میں نہیں ہو گی۔ اب وہ بھی اسے تڑپائیگی وہ بھاگ کر دالان میں جا چھپی۔ وہ اسے کمرے میں نہ پاکر کتنا مضطرب ہو جائے گا۔ وہ بھی دن بھر اس سے دور رہ کر کتنا بے چین رہا ہو گا........ وہ اسے دیوانہ وار سب کمروں میں ڈھونڈتا پھریگا۔ پھر جب وہ دالان میں مل جائے گی تو کتنی بیتابی سے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے گا۔ کچھ دیر تک وہ کچھ بول ہی نہ سکے گا۔ پھر وہ جھک کر آہستہ سے کہے گا۔ "نجمی! میری جان" اور وہ اس کے سینہ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودے گی۔ اتنا کہ اس کا دل پگھل کر آنکھوں کے رستے بہ جائے۔ جمیل اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے تسلی دے گا۔ "نجمی، میری نجمی" اور وہ اپنی نمناک آنکھیں اٹھا کر کہے گی۔ "آج کل تم مجھ سے کتنے دور ہو جمیل!" وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہے گا۔ تمہاری جدائی میں مجھے بھی اتنا ہی درد ہوتا ہے۔ لیکن کیا کریں۔ زندگی صرف رومان ہی تو نہیں۔" اور وہ جھک کر اس کے ہونٹ چوم لے گا۔ "لو جانی آج میں تمہاری خاطر کتابیں بھی نہیں پڑھوں گا۔" اور وہ دونوں خوش خوش اپنے کمرے میں واپس آئیں گے۔ پھر وہ پیار کی باتیں، میٹھی میٹھی شکائتیں!

لیکن جمیل کو آئے دس منٹ گذر چکے تھے۔ وہ اب اسے ڈھونڈتا ہوا نہ آیا تھا۔ نجمہ مایوس ہو گئی۔ وہ کیوں نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ اس سے ملنے کے لئے مضطرب نہیں ہے۔ شاید وہ وہیں کمرے میں لباس تبدیل کر کے لیٹ رہا ہو گا اس

نے تمام دن ذرا بھی آرام نہ کیا تھا۔ کتنی تکان محسوس ہو رہی ہو گی اس کو! وہ کتنی
بے رحم ہے۔ وہ خود ہی اس کے پاس جائے گی۔ نجمہ کمرے میں آئی۔ وہ یہاں بھی نہ تھا
اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا اپنے بھائی سے باتیں کر
رہا تھا۔ تو اسے اب بھی انتظار کرنا ہو گا۔ وہ تلخی سے نچلا ہونٹ چبانے لگی۔ آخر وہ
کب تک انتظار کرتی رہے گی۔ کب تک یہ درد سہتی رہے گی۔ وہ گھلی جا رہی تھی آخر
کب تک؟ وہ نڈھال ہو کر بچھونے پر گر پڑی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن کھانا
کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ یونہی گھلی جا رہی ہے۔ وہ صبح صبح
ہی آفس چلا جاتا ہے۔ وہ دن بھر اس کی یاد میں کھوئی اداس بیٹھی رہتی۔ جمیل کی یاد
اسے اتنا ستا رہی ہوتی کہ وہ کتاب پر توجہ نہ کر سکتی۔ ہاں کچھ دیر تک اپنے بچے کو
چاند کا ٹکڑا کہتے ہوئے اسے خیال آتا۔ بچہ تو صرف چاند کا ٹکڑا ہے۔ جمیل تو پورا
چاند ہے۔ اس کی ساری خوشیاں سمٹ کر جمیل کی ذات میں سما گئی تھیں۔ اس کی دنیا
جمیل تھی۔ کبھی کبھی آفس جاتے ہوئے وہ کہہ جاتا۔ "میرا یہ سوٹ تہہ کر کے رکھ دو جانی"
"نوکر سے کہہ دو مجھی شوز صاف کر کے ڈبوں میں رکھ دے۔" وہ بڑی محبت سے اس
کے کہے ہوئے کام کرتی تھی۔ بڑے پیار سے اس کے کوٹ تہہ کرتی۔ انہیں سینہ سے
لگا لیتی۔ شوز صاف کرنے کے لئے وہ نوکر سے نہ کہتی۔ خود ہی برش لے کر ان پر
سے گرد پونچھتی۔ اس کا جی چاہتا انہیں چوم لے ہاں جوتوں کو بھی! انہیں جمیل اپنے
پاؤں میں پہنتا تھا نا۔ پھر جب، اس کے آنے کا وقت قریب ہوتا۔ اس کی اداسی کم

ہونے لگتی۔ جیسے آہستہ آہستہ بادل چھٹ جائیں اور مطلع صاف ہو جائے۔ دل پر سے بوجھ اترتا جاتا۔ اب جمیل آئیگا وہ دھڑکتا ہوا دل لئے دروازہ کھولنے جائیگی۔ کواڑ کھلتے ہی یہ معلوم ہونے سے پہلے کہ وہ اندر آگیا ہے۔ وہ اس کے بازوؤں کی گرفت میں ہوگی۔ اس کے نرم ہونٹوں کے لمس سے مدہوش ہو جائے گی۔ اور اپنا سارا درد بھول جائے گی۔

......نہیں شاید یوں نہیں ہوگا۔ وہ تھکا ہوا آئیگا۔ پژمردہ اور وہ دروازے میں کھڑی ایک محبت بھری مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرے گی۔ وہ مسکراہٹ اس کی تکان دور کر دے گی۔ اس میں نئی جان ڈال دے گی۔ وہ اپنا تھکا ہوا سر اس کی گود میں رکھ دے گا۔ وہ ایک ماتا بھرے پیار سے اس کی خوبصورت پیشانی چوم لے گی۔ اور اپنی نازک انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتی ہوئی آہستہ آہستہ کوئی میٹھا ترانہ چھیڑے گی۔ اور وہ اس کی گود میں اس راگنی سے مدہوش ہو جائیگا۔ پھر اس کے کان میں وہ مانوس آواز آتی "نجمہ" وہ اپنے خیالات سے چونکتی دوڑی ہوئی جاکر دروازہ کھولتی۔ وہ تھکا ہوا ہوتا۔ وہ اس کی تکان دور کرنے کے لئے اپنے ہونٹوں پر ایک نرم میٹھی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتی لیکن وہ آتے ہی پوچھتا۔ "آج کا اخبار آیا ہے نجمی!" اور وہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آنے سے پہلے ہی سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔ وہ مایوس ہو کر اپنی پیاسی نظریں جھکا لیتی۔ اور اخبار لے آتی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر نہایت بے تابی سے اخبار لے لیتا اور

وہ ایک دبی آہ کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ جاتی۔ اس انتظار میں کہ اخبار ختم ہونے پر وہ اس کی طرف توجہ کرے گا۔ لیکن جمیل اخبار ختم کرکے دوسری کتابیں اٹھا لیتا۔ وہ ملتجیانہ لہجہ میں کہتی: "بہت تھک گئے ہو، ذرا آرام کرو نا!" "کیا کروں نجمی! پڑھنے کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔" پڑھنا پڑھنا! اُف یہ پڑھنا کبھی ختم بھی ہوگا۔ یہ کتابوں کا انبار۔ ہر روز اس انبار میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اچھی خاصی لائبریری بنا رکھی تھی اس پر بھی بس نہ تھا۔ وہ کوئی ان پڑھ لڑکی تو نہ تھی۔ کہ کتابوں سے بیر رکھتی اسے بھی کتابیں پسند تھیں۔ لیکن کوئی یوں بھی پڑھتا ہوگا۔ ان بے جان کاغذ کے تودوں کے سامنے اس کا دکھتا ہوا دل کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جمیل کو اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ دن بھر اس کے انتظار میں کتنی اداس رہی ہے۔ اُف یہ انتظار! مسلسل انتظار! وہ اس وقت بھی اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ گو وہ اس کے پاس ہی بیٹھا ہوتا۔ ساری توجہ تو کتاب پر مرکوز ہوتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اب بھی اس کے پاس بیٹھا رہ کر بھی اس سے دور ہے، بہت دور...... یونہی گیارہ بج جاتے اور اسے نیند آنے لگتی۔ اسے جمائیاں لیتی دیکھ کر وہ کہتا۔ "تمہیں نیند آرہی ہے، نجمی؟ سو جاؤ نا مجھے ابھی دس صفحے اور پڑھنے ہیں۔ میرا انتظار نہ کرو نجمی!" وہ چھوٹے پر لیٹ جاتی۔ ابھی دس صفحے اور؟ وہ بیتابی سے کتاب پہ نظریں جمائے رہتی جمیل کو ورق الٹاتے دیکھتی۔ ایک دو، تین، چار، پانچ —— اور نیند کے غلبہ سے اس کے پپوٹے بند ہونے لگتے۔ پھر بھی وہ اس کے انتظار میں بیدار رہتی۔ چھ، سات،

آٹھ۔ اس کے سر میں درد ہونے لگتا۔ آنکھیں بری طرح جل رہی ہوتیں۔ وہ ان جلتی ہوئی پلکوں کو بہ مشکل کھولے رہتی۔ نو، دس، آخر کار۔ وہ اطمینان کی ایک گہری سانس لیتی۔ لیکن ـــ مجھے غضب کی نیند آرہی ہے نجمی!" اور اس کی ابھرتی ہوئی امنگیں سینہ میں دب کر رہ جاتیں۔ وہ جمیل پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتی لیکن وہ سر سے پاؤں تک چادر تان کر سویا ہوتا۔ وہ اس کے چہرہ کو بھی نہ دیکھ سکتی۔ اس کا دل بے اختیار بھر آتا آنسو اُبل آتے۔ پھر اس کی جلتی ہوئی نمناک آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوجاتیں اور وہ سو جاتی۔ یونہی تشنہ لب، پیاسی!

آخر وہ کیا کر سکتی تھی؟ کیا وہ جمیل سے کہہ دیتی۔ کہ وہ کئی دنوں سے اس کی محبت کی پیاسی ہے۔ وہ اس کی ان محبت بھری نظروں، بے تاب بازوؤں کی گرفت اور شہد آگیں نرم ہونٹوں کے لمس کے لئے کتنا ترس گئی ہے۔ اس سے التجا کرتی کہ پہلے ہی کی طرح وہ پیار کی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہے۔ اسی طرح رنگین لفظوں میں شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ اس کے حسن کی تعریف کرے اسی بے تابی سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔ جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔ نہیں، اس کی خودداری یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ عورت میں وقار ہونا چاہیئے۔ حسن کو تو ناز ہی بھاتا ہے۔ حسن خود ہی نیاز بن جائے۔ تو اس میں وہ وقعت کہاں رہے گی۔ اگر یہ باتیں کہہ کر اپنا مقصد پالیتی تو اسے جمیل کی محبت میں وہ بیتابی، وہ بے ساختگی کہاں نظر آتے گی۔ اس کے دل میں ہمیشہ یہ احساس ابھرے گا

کہ وہ اس کے کہنے پر محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس لئے وہ زبان سے کچھ نہ کہتی۔ لیکن اس کی آنکھیں تو سب کچھ کہدیتی تھیں۔ کیا وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت جھلکتی ہے کتنی یاس چھپی ہوتی ہے۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مغموم حسن میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ ان حسین آنکھوں کی اداسی پتھر سے دل کو بھی پگھلا نہ دیتی پھر جمیل کا دل تو اتنا نرم تھا۔ اتنا محبت بھرا دل...... لیکن وہ اس کی آنکھوں کو دیکھتا ہی کب تھا۔ اسے کتابوں میں لکھے ہوئے نئے نئے افسانے پڑھنے سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی ہوئی مایوسیوں کا افسانہ پڑھتا!

پھر ایک دن اس نے جمیل سے اشارتاً کہہ بھی دیا تھا۔ اس وقت جب وہ آلڈس ہکسلی (Aldaus Huxley) کا مشہور ناول "پوائنٹ کاونٹر پوائنٹ" (Point Covnter Point) پڑھ رہی تھی۔ مصنف نے تین چار عورتوں کے مختلف کردار کھینچے تھے۔ جمیل نے پوچھا۔ "تم ان میں سے کونسے کردار کے خاکے میں ٹھیک بیٹھتی ہو؟ تم نے دیکھا، جانی، ہکسلی کے کردار اس ناول میں "ٹائپس" ہیں۔

بتاؤ تم ان میں سے کون ہو ان تین چار عورتوں میں سے" جواب میں فوراً کہہ اٹھی تھی۔ "ایلینار" اس وقت ایلینار کا کردار اس پر اس قدر بچتا تھا کہ اسے جواب دینے سے پہلے سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ گو ان میں

میں سے ہر ایک کے احساسات پڑھتے ہوئے اسے خیال ہوا تھا کہ اس نے خود بھی کبھی کبھی ایسا محسوس کیا ہے۔ لیکن اب فی الحال تو ایلینار کی تمثیل اس پر ٹھیک آئی تھی۔ عجیب اتفاق تھا جب جمیل نے اس سے یہ پوچھا تھا۔ وہ ایلینار ہی کے بارے میں پڑھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی ایلینار کی زندگی اس کی موجودہ زندگی سے کتنی ملتی جلتی ہے! ایلینار اس کا عکس ہے۔ ایلینار جس کا شوہر فلپ ہمیشہ کتابوں میں کھویا رہتا تھا۔ وہ اسے رومان و محبت کی دنیا میں لانے کی کوشش کرتی لیکن بے سود۔ فلپ جانتا ہی نہ تھا کہ جذبات کیا بلا ہوتے ہیں۔ اس کے تو گویا دل ہی نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو اس میں دماغ ٹھنسا ہوا تھا وہ تو سراپا دماغ تھا۔ خشک، ٹھوس خیالات کا اڈا۔ ہر وقت سوچتا، سوچتا۔ فلپ معمولی سے معمولی بات میں بھی کھینچ کھانچ کر کوئی نہ کوئی فلسفہ، کوئی منطق ڈھونڈ نکالتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات پیش آتے جس سے دوسروں کے جذبات میں ہلچل مچ جاتی۔ مگر فلپ کے جذبات کا برانگیختہ ہونا تو درکنار وہ متاثر بھی نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر بھی اس کے ٹھوس دماغ کے پرزے فوراً کام پر لگ جاتے اور وہ کوئی منطقی نتائج اخذ کرنے لگتا۔ اور ایلینار غریب لڑکی! وہ محبت کی کتنی پیاسی تھی خصوصاً اس کتاب میں وہ ایک سین پڑھ کر تو بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ سین جس میں فلپ اور ایلینار کار میں بیٹھے بمبئی کی گلیوں سے گذر رہے تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ فلپ کار چلا رہا تھا۔ ایلینار اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ اور چودھویں

کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک پر دو رویہ درخت تیزی سے ان کی نظر کے سامنے سے گذر جاتے اس خوش گوار فرحت انگیز فضا میں، ایلینار کے دل میں رومانی جذبات اُمڈ رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے اپنے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر چاند پر نظریں جمائے بولی۔

"پیارے فل! تمہیں یاد ہیں وہ چاندنی راتیں؟"

فلپ بھی چاند کو دیکھ رہا تھا لیکن چاند بھی اس کے دماغ میں خشک اور ٹھوس خیالات کی تخلیق کر رہا تھا۔ یہ رومانی ماحول بھی اس میں کوئی لطیف جذبہ پیدا نہ کر سکا۔ وہ بیوی کے سوال پر چونکا "کونسی چاندنی راتیں؟" اور ایلینار کی ساری اڈتی ہوئی امنگیں سرد ہو گئیں "تم وہ راتیں بھول گئے ہو فل؟ وہ حسین چاندنی راتیں جو ہم اس باغ میں گذارا کرتے تھے۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہم اکثر چاندنی راتوں میں اس باغ میں چلے جاتے۔ وہ محبت کی راتیں آہ! وہ دن بھی کیا دن تھے!" ایلینار نے ایک سرد آہ بھری۔ "تم ان محبت کی یادگار حسین راتوں کو بھول گئے ہو؟"

"میں بھولا نہیں ایلینار۔ لیکن تم صرف "وہ چاندنی راتیں" کہو تو میں انہیں راتوں کو کیسے خیال کر سکتا ہوں؟ میں تو اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"تم اب مجھ سے محبت نہیں کرتے فل!" ایلینار رو پڑی۔ "اب تمہیں مجھ

سے پہلی سی محبت نہ رہی۔ اگر ہوتی تو تمہیں ان راتوں کی یاد آجاتی۔ سچ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔"

"لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں ایلینار"..... ہاں ایلینار بھی جانتی تھی کہ فلپ اس سے محبت کرتا ہے لیکن ایسی محبت بھی کس کام کی جس کا اظہار ہی نہ ہو۔ وہ محبت جس کو کتابوں کے تودے نے دل کے کسی تاریک گوشہ میں کھسکا دیا ہے جو منطق کے بوجھ تلے دبی دم توڑ رہی ہے۔ ہاں فلپ کا دل بھی تو کتابوں سے بھرا پڑا تھا..... اور یہ سین پڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود ایلینار ہے۔ اور جب جمیل نے پوچھا تھا کہ وہ ناول کی کرداروں میں سے کون ہے تو وہ جھٹ کہہ اٹھی تھی ایلینار! شاید یہ جواب سن کر جمیل نے قیاس کرلیا تھا کہ وہ کیوں اپنے آپ کو ایلینار کہہ رہی ہے۔ شاید اسے چرکا بھی لگا تھا اس نے جلدی سے پوچھا۔ "تو میں فلپ ہوں؟" اس کے جی میں آیا تھا کہ کہدے "ہاں فلپ ہی تو ہر وقت کتابوں میں گھسے رہتے ہو۔" لیکن اس نے کچھ سوچ کر یہ جواب نہ دیا تھا۔ "فلپ ـــــ تو نہیں ـــــ ہو" اس نے کہا تھا۔ لیکن ایک لمبی راگ کھینچ کر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ چند دنوں سے وہ پورا فلپ نہیں تو کم از کم تین چوتھائی فلپ ضرور ہے۔ لیکن جمیل نے شاید اس اشارے کو نہ سمجھا۔

کیونکہ وہ اس جواب سے مطمئن ہوگیا تھا اور ہنس کر کہا تھا "لیکن آگے چل کر تو دیکھو تمہاری ایلینار کیا گل کھلاتی ہے۔"

اس سے آگے پڑھ کر دیکھا تھا۔ ایلینار نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اپنے شوہر کو کچھ دیر کے لئے تو رومانی دنیا میں لائے۔ اس کے سینہ میں کبھی کبھی جذبہ کی ایک لہر تو پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ فلپ اتنا غیر رومانی تھا ہر وقت کی سوچ بچار نے اس کے جذبات کو سکھا دیا تھا۔ ایلینار آخر تنگ آگئی تھی۔ اس میں بغاوت سی پیدا ہو گئی۔ آخر وہ کیوں اپنی خوشی کو اس خشک آدمی پہ قربان کر دے۔ دکھتی دکھاتی کیوں اپنے ارمانوں کا خون کرے کب تک اپنے دل کو پیاسا رکھے۔ وہ ایسے آدمی کی تلاش کرے گی جو محبت کا اظہار کرنا جانتا ہو۔ پھر ایک دوست ان کے گھر آیا تھا۔ جو ایلینار کی شادی سے پہلے اس سے محبت کرتا تھا اس نے ایلینا کو یقین دلایا کہ وہ اب بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ "آخر تم کیوں اس سرد مہر خشک فلپ کے ساتھ رہ کر اپنا حسن اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ تم نہیں جان سکتیں ایلینا میں تمہیں کیسی محبت دے سکوں گا۔ تمہیں ایسی محبت نصیب ہی کہاں ہوئی ہے! تم نہیں اندازہ لگا سکتیں میری محبت کیسی ہو گی۔ اتنی شاعرانہ، اتنی گہری، اتنی گرم اور جوش بھری" اور ایلینار نے ان باتوں سے مسحور ہو کر یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ فلپ کو چھوڑ دے گی اور اس آدمی سے شادی کر لے گی۔۔۔۔ تو ایلینار نے یوں کیا تھا وہ ایلینار جس کو وہ اپنا عکس سمجھ رہی تھی۔ تو کیا اب بھی وہ ایلینار ہے۔ کیا وہ بھی ایلینار کی طرح جمیل کا ساتھ چھوڑ دے گی؟ اُف وہ اس خیال سے کانپ گئی نہیں، ہرگز نہیں، وہ ہمیشہ جمیل کی رہے گی۔ جمیل فلپ کی طرح سرد اور خشک تو نہیں تھا۔

صرف یہ بات تھی کہ جب سے اس نے پریکٹس شروع کی تھی۔ اس کو بہت کم فرصت ملتی تھی اور پڑھنے لکھنے کا اسے اس قدر شوق تھا۔ تھوڑا بہت جو وقت ملتا تھا۔ اسی میں صرف ہو جاتا۔ ورنہ وہ پہلے کتنی گرم جوشی سے محبت کا اظہار کیا کرتا! وہ محسوس کرتی کہ شاید ہی کوئی شوہر اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہے۔ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہے۔ اور وہ خود بھی تو ایلینار سے الگ تھی۔ ایلینار نے معمولی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے شوہر کے بلند خیالات کو صرف تحسین کی نگاہ سے دیکھ سکتی تھی۔ نہ تو ان کتابوں کو پڑھ کر سمجھ سکتی تھی جنہیں فلپ پڑھا کرتا تھا۔ نہ ہی اس سے تبادلہ خیالات کر سکتی تھی۔ فلپ کے خیالات کی اڑان کا ساتھ دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ فلپ کے ساتھ اس کی دلچسپی کی باتیں کر سکتی۔ اس کے خیالات میں حصہ لے سکتی تو شاید اپنے آپ کو اتنا تنہا محسوس نہ کرتی۔ لیکن وہ خود تو گریجویٹ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں ذہین بھی، کالج بھر میں اس کی ذہانت کی دھوم تھی جمیل تو اس کی ذہانت دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ کتابیں پڑھا کرتے ناولوں اور افسانوں پر تنقیدی بحث کرتے۔ ان کے ذوق میں کتنی یکسانیت تھی۔ دونوں کو وہی افسانے پسند آتے دونوں کو کسی افسانے میں ہی خاص خامی کھٹکتی اور وہ اپنی اس ہم خیالی پر خوشی سے جھوم جاتے۔ جمیل دیوانہ وار اسے کھینچ لیتا۔ "واقعی، جانی ہم دونوں صحیح معنوں میں ایک ہیں" پھر وہ اس پر جھک کر دبی آواز میں کہتا ع

"من تو شدم تو من شدی"

وہ اپنے ہونٹوں پر ان جلتے ہوئے ہونٹوں کو محسوس کرتی اور نیم بیہوش سی ہو کر آنکھیں میچ لیتی..... برآمدے سے کرسیوں کے پیچھے ہٹانے کی آواز آئی۔ شاید ان کی باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ہونہہ! وہ اب آئے گا۔ بے شک آئے گا وہ پلنگ سے اٹھ کر مسکراتی ہوئی اس کا استقبال نہ کرے گی۔ یونہی منہ پھیر کر سوتی رہے گی۔ تکیوں میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ رہے گی۔ وہ سیدھے اس کے پاس آئے گا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے۔ "روٹھ گئی ہو جانی۔" وہ اسے گدگدائے گا۔ وہ مچل کر کروٹ بدلے گی۔

"معاف کر دو نا" وہ یوں بے حس پڑی رہے گی جیسے سچ مچ سو رہی ہے۔ "دیکھو ہاتھ جوڑتا ہوں میرے من مندر کی دیوی!" وہ آنکھیں کھولے بغیر مسکرا دے گی۔ "معاف کر دو نا جانی!"

وہ آنکھیں کھول کر ناز سے کہے گی۔ "اچھا معاف کیا۔"

"نہیں مجھے سزا ملنی چاہیئے۔ ان نازک ہاتھوں سے ایک طمانچہ لگا دو نا"

"میں اور تمہیں تھپڑ ماروں۔ مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ تم میرے سرتاج ہو جمیل!"

"ان پھول سے ہاتھوں کا تھپڑ بھی کوئی تھپڑ ہو گا۔ مار دو نا جانی۔ دیکھو مجھے چین نہ آئے گا۔" اور وہ شوخی سے مسکراتی ہوئی پیار سے اس کے گال پہ ایک ہلکی سی تھپکی دے گی۔ اور جمیل اسی ہاتھ کو بے تابی سے چوم لے گا۔

لیکن وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ نجمہ نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اس کمرے کی طرف نہیں۔ اپنے بھائی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شاید بھائی کو اپنے

کمرے میں پہنچا کر آئے گا۔ کوئی آخری بات کرنی ہو گی۔ لیکن اُف! وہاں بھی وہ کرسی پہ جم گیا اور باتیں شروع کر دیں۔ تو یہ انتظار ابھی ختم نہیں ہوا۔ آخر وہ کب تک انتظار کرے گی۔ صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ کوئی کب تک صبر کرے۔ نجمہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔ کیا وہ جان بوجھ کر بے پروائی برت رہا ہے۔ جمیل سمجھتا ہو گا کہ وہ اس سے دور رہے، تو وہ اس کی طرف اور کھنچی چلی آئے گی۔ ہونہہ! وہ کیوں کھنچے گی۔ بڑا فخر ہو گا اس بات کا "نجمہ مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔" ہونہہ! وہ کیوں جان دینے لگی۔ جب اسے اتنا ستایا جائے۔ وہ کیوں سارا دن اس کی یاد میں کھوئی رہے۔ اس کا صلہ اسے کڑھنے کے سوا کیا مل رہا ہے۔ جب وہی اتنا بے پروا ہو گیا ہے۔ تو وہ بھی بے پروا ہو جائے گی۔ وہ بھی اس سے دور دور رہے گی۔ نجمہ پلنگ سے اُتر گئی اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ یہاں چارپائی پر بچھونا پڑا ہوا تھا۔ وہ چادر تان کر لیٹ گئی لیکن نیند کیسے آئے غصّہ بری طرح چڑھ رہا تھا۔ جسم جل رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ حلق میں کوئی چیز اٹک رہی ہے۔ سسکیاں اس کے گلے میں گھٹ رہی تھیں۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جمیل پر یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتی۔ آج رات وہ یہیں سوئے گی۔ جمیل کے ہزار منت کرنے پر بھی نہ جائے گی۔

بچہ جاگ اٹھا۔ کہیں دودھ کا وقت تو نہیں؟ نجمہ نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ دودھ کا وقت نہیں تھا۔ وہ لیٹے لیٹے ہی گہوارہ آہستہ سے جھلانے لگی۔

گیارہ! کیا وہ اب بھی نہیں آئے گا۔ کیا جمیل جان بوجھ کر اسے تڑپا رہا ہے؟ کیا وہ اب بھی نہیں آئے گا۔ کیا وہ اپنے "قیمتی وقت" میں سے پانچ دس منٹ بھی اسے نہیں دے سکتا؟ آخر وہ کورٹ سے لوٹتے ہی کیوں کتابوں میں ٹھنس جاتا ہے؟ صبح آفس جاتے ہوئے تو اتنی جلدی میں ہوتا ہے۔ ہر وقت یہی رٹ لگی رہتی ہے "مجھے جلدی جانا ہے۔" "وقت نہیں ہے۔" "ابھی سے لیٹ گیا ہوں"......
دروازہ کھلنے اور بجلی کا بٹن دبانے کی آواز؟ جمیل اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔ نجمہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی کپڑے بدل رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آنے کے لئے کتنا بے تاب ہے! نجمہ مسکرائی۔ لیکن وہ تو نہیں جائے گی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بے حس پڑی رہی تاکہ جمیل سمجھ لے وہ سو رہی ہے۔ اس نے اپنی گردن کے گرد کسی کے ہاتھوں کو محسوس کیا۔ جمیل اسے سوتی سمجھ کر پیار سے اس کی موتی کی مالا اور بُندے نکال رہا تھا۔ دوسرے لمحہ میں وہ جمیل کی گرفت میں تھی اور وہ محبت بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی "اٹھو نجمی پیاری، چلو ہمارے کمرے میں۔" اور نجمہ بھول رہی تھی کہ وہ جمیل سے خفا ہے اس کا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ مسکرا دے۔ یونہی آنکھیں بند کئے مسکراتی ہوئی وہ بہت دلکش نظر آتی تھی۔ جمیل کو اسکی یہ ادا بہت ہی پسند تھی۔ ہر صبح وہ اس سے پہلے بیدار ہو جاتا تھا۔ وہ نیم خوابی کی حالت میں آنکھیں بند کئے پڑی رہتی...... پھر بھی اسے معلوم ہو جاتا تاکہ جمیل کی پر شوق نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں اور جمیل کہہ اٹھتا۔

"اُف یہ حسنِ خوابیدہ!" "عورت سوئی ہوئی کتنی حسین لگتی ہے۔" اور وہ یونہی آنکھیں بند کئے مسکرادیتی تو جمیل کیسے بے خود ہو جاتا تھا۔ نجمہ کے سارے عزم ٹوٹ رہے تھے وہ سب کچھ بھول کر اپنے آپ کو جمیل کے سپرد کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن پھر اس پر غصہ چڑھا آ رہا تھا۔ جمیل نے اسے کتنا ستایا تھا۔ وہ اتنا جلد اس کی باتوں میں آجائے گی "نجمی اٹھو بھی"۔ "ڈارلنگ" "آؤ جانی"۔ نہیں، وہ نہیں جائے گی، وہ کیوں بزدلوں کی طرح سوتی بن رہی ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر جمیل کو بتا دے گی کہ وہ جاگ رہی ہے اور اس کے ساتھ آنا نہیں چاہتی نجمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ جمیل نے جھک کر اس کا گال چوم لیا۔ لیکن نجمہ جلدی سے منہ پھیر کر سو گئی۔ "تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو جانی؟" وہ منہ پھلائے رہی۔ "کیوں آخر کیوں بولو نجمی؟" وہ نہیں بتائے گی کہ وہ کیوں ناراض ہے اگر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے لئے کتنی بے چین رہی ہے تو جمیل کو اور خوشی ہو گی۔ اسے خوش کیوں ہونے دے گی۔ وہ تو اس سے انتقام لے رہی ہے۔ وہ بھی اسے ستائیگی۔ خوب ستائیگی۔ "نجمی اب آ بھی جاؤ۔" وہ پھر منّتیں کر رہا تھا۔ کیا وہ چلی جائے؟ وہ اب جاتے پر راضی ہو جائے گی تو جمیل خیال کرے گا۔ کہ وہ دو ایک میٹھی باتوں سے من جائیگی۔ وہ کیوں منے گی۔ وہ روٹھی رہ کر جمیل کو بتا دے گی کہ اسے منانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ جمیل نے اسے اتنا تڑپایا ہے وہ دو ایک میٹھی باتوں سے من جائے گی؟ لیکن مناتے مناتے جمیل خفا ہو جاتے۔ تو معاملہ طول نہ کھینچے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اسے یہیں ختم کر دیا

جائے۔ طول کھینچے تو کھینچے وہ اتنا جلد نہ مانے گی.... جمیل اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا رہا تھا۔ اسی وقت بچہ جاگ اٹھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ جمیل کی گرفت سے نکل گئی اور بچہ کو گود میں لے لیا۔ جمیل کچھ دیر اس کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ "نجمی نہیں آؤ گی؟" نجمی نے یونہی منہ پھلائے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا جمیل کے مردانہ وقار کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ آخر وہ کب تک منائے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا" بچے کو سلا دیا..... اب وہ چلی جائے؟ بس ستا چکی نا؟ ہونہہ کہاں ستا چکی۔ صرف چند منٹ؟ نہیں، جمیل کو رات بھر اس کے لئے تڑپنا ہوگا وہ صبح کو بھی نہیں جائیگی۔ آج ہی نہیں ہمیشہ اس سے دور رہے گی۔ اور اس وقت جمیل کو بھی تڑپنا پڑے گا۔ تب اسے محسوس ہوگا۔ کہ وہ بھی کتنے دنوں سے اس کے لئے تڑپا کی ہے۔ نجمہ نے آخر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور چادر تان کر لیٹ رہی۔

نجمہ کو نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ وہ غور سے سن رہی تھی کیا جمیل سو گیا ہے نہیں تو وہ بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ جمیل بھی اس کے بغیر کتنا بے چین ہے جمیل واقعی اس سے بے حد محبت کرتا ہے دل کی گہرائیوں سے۔ وہ کتنی ناشکرگذار ہے کہ ایسی گہری محبت کی قدر نہیں کرتی۔ ہونہہ! چلی ہے گلہ کرنے جمیل اب پہلے کی طرح زبان سے محبت کا اظہار نہیں کرتا..... محبت کا اظہار محبت کے لئے کسوٹی تو نہیں ہے اس کے برخلاف یہ کہا جاتا ہے کہ سچی محبت وہ ہے جس کا اظہار نہ کیا جائے۔ آج کل جمیل اپنی محبت کا شاعرانہ وارفتگی سے اظہار

نہیں کر رہا تھا تو کیا ہوا۔ اس کی ہر بات ہر حرکت سے کتنی محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خاموش محبت جھلکتی تھی۔ وہ ہمیشہ خیال رکھتا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے جمیل کتنا پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ رات کے دو یا تین بجے جب اسے متلی سی محسوس ہوتی یا سینے میں جلن ہونے لگتی وہ آہستہ سے اُٹھ بیٹھتی۔ بہت ہی آہستہ سے تاکہ جمیل کی نیند میں خلل نہ پڑے لیکن جمیل۔ اس کا جمیل! کتنی ہی گہری نیند میں ہو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ "تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے جانی؟ سینے میں جلن؟" وہ کتنی دیر تک آہستہ آہستہ سہلاتا۔ اس کے کندھے پر سر رکھے ہوئے وہ محسوس کرتی کہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ جب اسے متلی ہوتی تو جھٹ دوڑ کر پانی اور بیسن لے آتا خواہ باہر کتنی ہی سردی لگ رہی ہو"...... یہ اس کا پہلا بچہ تھا، اور کبھی کبھی خوف اس کے دل کو جکڑ لیتا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بچے کی پیدائش ماں کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش ہے۔ ایک نئی زندگی کو جنم دیتے ہوئے ماں موت کے منہ میں چلی جاتی ہے...... اور ایک دن بے خبری میں اس نے اپنے تہار ازدان، دکھ درد کے ساتھی جمیل پر یہ خوف ظاہر کر دیا تھا۔ اس کے سینہ سے لگ کر، سہمی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر کہا تھا۔ "جمیل میں بچ نہ سکوں تو؟" اور جمیل کو جیسے بجلی مار گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اور اس نے اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی جیسے وہ اُسے نہیں چھوڑے گا اگر موت بھی چھیننے کی کوشش کرے۔ دم

اس کے گلے میں گھٹ گیا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔
"ایسا نہ کہو نجمی! خدا ہمیں جدا نہیں کرے گا، وہ اتنا بے رحم نہیں ہے۔ وہ تمہیں مجھ سے
نہیں چھینے گا۔ میری روح کو مجھ سے نہیں چھینے گا۔ موت کو بھی ہمارے پیار پر رحم آجائیگا۔۔ جمیل کی حالت
کس قدر دگرگوں ہوگئی تھی اُس دن۔ نجمہ اسے تسلی دیتی رہی تھی۔" میں نے
یونہی کہہ دیا تھا۔ بھلا میں کیوں نہ بچوں گی۔ اتنی تندرست جو ہوں۔" لیکن جمیل کو
جانے کیا ہو گیا تھا اس دن۔۔۔۔۔ جب جمیل کے دل کی گہرائیوں میں اس کے لئے
اتنی محبت نہاں ہے تو کیا یہ سراسر زیادتی نہیں ہے کہ وہ زبانی اظہار بھی چاہتی ہے؟
پھر جمیل تو اظہار بھی کیا کرتا تھا ایسی ہی شاعرانہ وارفتگی سے۔ صرف آج کل دن بھر کی
دکان اور پھر کتابوں کے کثیر مطالعہ سے وہ ذرا خشک سا ہو گیا تھا۔ ورنہ اس کا
جمیل فطرتاً کتنا شاعر مزاج اور رومانی تھا۔ رومانی ہی نہیں جذباتی بھی۔ جب وہ
چند دن کے لئے بمبئی گیا ہوا تھا۔ تو کس قدر جذباتی ہو گیا تھا۔ صرف چند ہی دنوں۔
کی جدائی نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ رومانی خطوط جو بمبئی سے لکھا کرتا تھا۔
ان سے کتنا اضطراب، کتنی بے تابی، کتنی جذباتیت جھلکی پڑتی تھی۔ وہ ان خطوں
کو سینہ سے لگا لیتی۔ دیوانہ وار چومتی۔ ان کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہو
جاتا تھا۔ بمبئی سے واپس ہونے کے بعد بھی۔ وہ جنون، وہ اضطراب! اُف! ان
دنوں وہ کتنا جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ جمیل کے کشادہ سینے سے سر لگائے ان محبت پاش
آنکھوں میں دیکھ رہی ہوتی۔ جمیل کا دل کس زور سے دھڑک رہا ہوتا وہ اسے اپنے

آہنی بازوؤں میں جکڑ کر بھینچ رہا ہوتا۔ قریب اور قریب۔ گرم سانسوں کے درمیان اس کی بے تاب کانپتی ہوئی آواز نجمہ کے کانوں میں گونجتی: "نجمی میری حسین ترین نجمی۔ اگر میں ایک دن اور بمبئی میں رہ جاتا، اس کے بعد ایک دن بھی تم سے جدا رہتا تو میں دیوانہ ہی ہو چکا ہوتا۔" "تم نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے نجمی!" "ڈارلنگ، مائی اون ڈارلنگ۔" "میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میری جیون ساتھی ہو۔ میری اپنی ہو، نجمی میری نجمی" پھر وہ اسے اتنے زور سے بھینچ لیتا جیسے اس کو اپنی ہستی میں سمو دے گا۔ اور وہ وہ جمیل کے دل سے لگی ہوئی محسوس کرتی کہ جمیل کی محبت اُس کی رگ رگ میں پھڑک رہی ہے۔ وہ اپنے جمیل کے لئے جان بھی دے دیگی۔ اپنا سب کچھ جمیل کے قدموں میں نچھاور کر دے گی۔ اس کی محبت میں وہ آگ ہوگی کہ.....

بچہ رونے لگا۔ نجمہ نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج رہا تھا۔ اف! وہ اب تک سو نہ سکی تھی۔ بچہ کو دودھ دینے کا وقت تھا۔ وہ اٹھی۔ دریچہ میں رکھی ہوئی بوتل میں دودھ انڈیل کر اس میں تھوڑی سی شکر ملائی اور نپل لگا کر بچہ کے منہ میں دے دیا اور آہستہ آہستہ ہنگوڑہ ہلانے لگی۔ بچہ یونہی دودھ پی کر سو گیا۔ گہوارہ کی کیں کیں بند ہوئی ہی تھی کہ ساتھ والے کمرے سے پلنگ کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ جمیل بار بار کروٹ بدل رہا تھا۔ کیا جمیل کو بھی نیند نہیں آرہی ہے؟ وہ اس کے پاس نہ ہونے سے بے چین ہے؟ جمیل کو اس سے کتنی محبت ہے! جمیل اس کا جمیل! معصوم شاعر مزاج اور جذباتی۔ جمیل کی فطرت بلور کی طرح پاک اور شفاف

ہے۔ وہ ضرور رومانی ہے۔ اس کا جمیل، اس کے دل کا مالک، اس کا پیارا جمیل کتنی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا ہے۔ کیا اس لئے نہیں کہ وہ جان لے وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔ کیا جمیل کو معلوم ہو گیا تھا کہ بچہ اٹھنے پر نجمہ بھی جاگ اٹھی ہے اور اسے دودھ دے کر سلا چکی ہے۔ کیا وہ اس لئے کروٹیں نہیں بدل رہا تھا کہ وہ یہ معلوم کر کے کہ وہ جاگ رہا ہے اس کے پاس چلی آئے گی۔ ہاں اس کی کروٹیں کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو نجمی میں کیسے جان گیا کہ تم جاگ اٹھی ہو۔ اب آ بھی جاؤ جانی! دیکھو میں کتنی بے چینی سے ساری رات آنکھوں میں کاٹ رہا ہوں۔" نجمہ کا جی چاہ رہا تھا کہ چلی جائے۔ ضرور چلی جائے گی۔ اس سے لپٹ جائیگی۔ سینہ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔ "مجھے معاف کر دو جمیل۔ میرے سرتاج مجھ سے غلطی ہوئی۔" وہ جمیل کی آواز سننے کے لئے ہمہ تن گوش بن گئی تھی۔ کاش جمیل اس کو ایک ہی دفعہ پکارے!..... لیکن اب تو وہ کروٹیں بھی بدل نہیں رہا تھا۔ کیا وہ سو گیا ہے؟ سو گیا ہو گا۔ وہ کیوں جاگے گا اس کے لئے؟ اسے تو اور بھی آرام ہوا۔ نجمہ کو پھر اس پر غصہ آنے لگا۔ وہ فطرتاً رومانی ہے تو کیا؟ اپنے جذبات کو یوں کچل کچل کر رکھتا ہے وہ جذبات کے اڈتے ہوئے سیلاب میں بہ جانا چاہتی تھی اور جمیل جذبات کو کمزوری سمجھتا ہے۔ عقل کو ہر بات میں رہنما کرنا چاہتا ہے۔ جمیل اتنا جذباتی دل رکھتے ہوئے بھی دماغ کو دل پر حاوی کرنا چاہتا تھا۔ اُف! یہ کتابیں! یہ خشک

کتابوں کا مطالعہ ہی تو تھا جو اسے یوں اپنی جذباتی فطرت چھپانے پر مجبور کرتا تھا کتابیں تو گویا اس کی رقیب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اتوار کا دن بھی! وہ اس دن کا کتنی بے تابی سے انتظار کیا کرتی۔ لیکن اس دن بھی جمیل کو اپنا کوئی مقدمہ دیکھنا ہوتا یا لائبریری کو واپس کی جانے والی کتابیں پڑھ کر ختم کرنی ہوتیں...... شام کے چار بجے وہ بڑے اصرار سے اسے کچھ دیر سیر کر آنے پر آمادہ کرتی۔ کہیں جاؤ تو جمیل! دن بھر گھر بیٹھے تمہارا جی نہیں اکتاتا؟ جمیل کتابوں میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے سیر تفریح تک کا خیال نہیں آسکتا۔ سینما کو بھی وہ شاذ ہی جایا کرتا تھا کبھی کبھی تو مہینوں نہیں جاتا تھا۔ جب تک کوئی بلند پایہ فلم نہ آتی "قسمت دیکھنے چلائیں گے جمیل! تیسری دفعہ آیا ہے۔ ہم نے اب تک نہیں دیکھا۔" "ارے بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کیا ہوتا ہے بھئی۔ چند ایک پاپولر قسم کے گانے اور ناچ۔ ہمیشہ ایک ہی قسم کی معمولی کہانی جس میں گہرائی ہی نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک اینٹرٹینمنٹ! ہمیشہ باکس آفس کی کامیابی پر نظر رہتی ہے ان کی۔ "ہمراہی" آئیگا تو ضرور جائینگے" "ہمراہی یہاں جانے کب آئیگا۔ کتنے دنوں سے ہم نے کوئی فلم ہی نہیں دیکھا۔" Daphne DE Murier کا "ربیکا" آرہا ہے۔ ضرور دکھاؤں گا تمہیں اور آئندہ ہفتہ تو چھاؤنی کے سینما ہاؤس میں ایسے اچھے اچھے فلم آرہے ہیں۔ پھر کیا روز روز جائیں گے، پرل بک کا "ڈریگن سیڈ" امپیریل میں آرہا ہے، پلازا،

گھنیری بدلیوں میں

میں رشیل فیلڈ کا آل وِس اینڈ ہیون ٹو، جیمس ملٹن کا رینڈم ہارویسٹ،...... وہ زیادہ تر آتھرس کا نام ہی لیا کرتا تھا۔ سٹارس کا شاذ ہی بہت اچھے اداکار ہوں تو" ربیکا میں لارنس اولیور نے کام کیا ہے رینڈم ہارویسٹ میں رونلڈ کولمین نے"
...... اتوار کی شام وہ بڑے اصرار سے اسے باہر بھیجتی۔ جب اس کے لوٹنے کا وقت قریب ہوتا تو وہ کوئی ایسی ساری پہنتی جو اسے بہت بھاتی تھی۔ بالوں کو ایسے انداز میں بناتی جیسے جمیل پسند کرتا تھا۔ طرح سے آگے پیچھے بالوں میں پھول لگاتی۔ پیشانی پر تلک بھی لگا لیتی۔ جب بن سنور کر آئینہ میں دیکھتی تو خوش ہو جاتی۔ اُف یہ نکھار! جمیل کے ہوش وحواس پر بجلی ہی تو گرا دے گی۔ جمیل اسے دیکھتے ہی کیسے بے خود ہو جائے گا۔ پھر وہ رنگین سپنوں کے محل! اتنے میں جمیل کی آواز آتی۔ وہ تصور سے چونکتی۔ بیداری میں جمیل کا ساتھ تو ان سپنوں سے کہیں حسین ہوگا جمیل کی آواز سن کر اسکی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ کچھ دیر بعد جمیل اس کے سامنے کھڑا ہوتا۔ خوبصورت اُونی سوٹ میں ملبوس اس قدر سمارٹ، اس قدر سجیلا، اتنا شکیل، جمیل کو بے خود کرنے چلی تھی۔ وہ خود بے خود ہو اٹھتی۔ اس کی باہیں جمیل کو سمیٹ لینے کے لئے بے تاب ہو جاتیں۔ اس کا جی بے اختیار چاہتا بوسوں کی بارش کر دے۔ جمیل کے رسیلے بھرے ہوئے ہونٹوں پر، ان لانبی پلکوں والی حسین نیلی آنکھوں پر، اُبھرے ہوئے رخساروں پر، شفاف پیشانی
...... "دیکھو نجمی! آج میں کیسی اچھی اچھی کتابیں لے آیا ہوں۔ خوش ہو جاؤ گی تم"

اور نجمہ کے جلتے ہوئے ہونٹ سرد پڑ جاتے۔ ان پر بوسے منجمد ہو جاتے۔ اس نے کتنی دیر سے جمیل کے لئے سنگھار کر رکھا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے سپنے! جمیل کسی پارک یا فلم دیکھنے گیا ہو گا۔ اور اس رومانی ماحول کے زیر اثر پہلے ہی سے اس کے دل میں امنگیں اٹھ رہی ہونگی۔ پھر جب وہ اس کا حسن دیکھے گا تو کیسے بے خود ہو جائے گا اور یہاں جمیل نے پارک یا سینما جانے کی بجائے بک سٹالس اور لائبریریوں کی خاک چھانی تھی۔ جمیل ایک ایک کر کے کتابیں بیگ میں سے نکال کر اس کے سامنے رکھتا جاتا۔

"بیڑس اور سڈنی ویب کی سوویٹ کمیونزم اتنی سستی مل گئی۔ سوچو تو ساٹھ روپے کی کتاب پچیس روپے میں! کیا بتاؤں تمہیں کیسی ہے یہ کتاب اشتراکی نظام روس میں عملی طور پر کیسے چل رہا ہے۔ یہ جاننا ہو تو میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔"

"دو بڑی شاندار ناولیں لے آیا ہوں نٹ ہیمسن کی "Hunger" اور دستاوسکی کی "کرائم اینڈ پنشمنٹ"۔"

ورجینا وولف کی Waves اور جارج سیمینان کی "دی شیا ڈو فالس" بھی خرید لیا۔ تم ان کی تکنیک دیکھنا چاہتی تھیں نا!"

"کرشنا ہتی سنگھ کی آٹو بیاگرافی With no Reghets تم ایک ہی بیٹھک میں ختم کر دوگی۔ یہ کتاب ایسی دلچسپ اور Readable ہے۔

اور یہ کرسٹوفر اشروڈ کی "گڈ بائی ٹو برلن" رالف فاکس کی "دی ناول اینڈ دی پیپل" اور ای۔ ایم فارسٹر کی ..... اُفوہ میرے اللہ! ای۔ ایم فارسٹر کرسٹوفر اشروڈ، اپٹن سنکلر

سٹیفن سپنڈر، ولیم سارو ین، الیا اہرن برگ جانے کون سے کون سے نام اس کے کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ نہ جانے وہ ان کے متعلق کیا کیا کہہ رہا ہوتا۔ نجمہ کی آنکھیں جمیل کے خوبصورت چہرے پر جمی ہوئی ایک تشنگی کے ساتھ اس کا حسن پی رہی ہوتیں اس کے ہونٹوں میں پھر چنگاریاں سی سلگنے لگتیں۔ اس کا جی چاہتا اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے جمیل کے ہونٹوں کو خاموش کر دے۔ ایک وحشت کے عالم میں چیخ اٹھے۔ "جمیل اپنے حسن پر تو رحم کرو جمیل! اُف تم تو یہ بھی نہیں جانتے تم کتنے سجیلے لگ رہے ہو۔ جمیل دیکھو تم کتنے خوبصورت نظر آرہے ہو، ادھر دیکھو میں کیسی نظر آرہی ہوں"..... بازو والے کمرے سے، پلنگ کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی۔ "کیا پھر جمیل کروٹیں بدل رہا ہے اسے بھی نیند نہیں آرہی ہے؟" نجمہ نے جھک کر دیکھا۔ جمیل نے پھر دوسری طرف کروٹ لی۔ جمیل اس کے لئے کتنا بے چین ہو رہا ہے! اور وہ ہے کہ گلہ پر گلہ کر رہی ہے۔ وہ آتے ہی کتابوں کی باتیں شروع کر دیتا تھا تو کیا۔ اسے اپنی نئی خریدی ہوئی کتابیں دکھانے میں خوشی ہوتی تھی۔ کیا اس کے بعد اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا؟ "اُف نجمی تم تو غضب کرتی ہو۔ وہ اس کے بے تاب بازوؤں میں ہوتی۔ "کتنی، کتنی حسین لگ رہی ہو تم۔ پہلے ہی تمہاری آنکھیں اتنی کالی ہیں اس پر یہ کاجل کی تحریر اور پیشانی پر یہ ٹیکہ کیسے سجتا ہے تمہیں۔ تم مجھے دیوانہ بنا دوگی نجمی!" اتنا ہو کر بھی وہ اس سے گلہ کر رہی ہے۔ آخر وہ جمیل سے کیسے امید کر سکتی تھی کہ وہ ہمیشہ اظہارِ محبت کرتا ہے

وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی تھی۔ جمیل سمجھتا اسے کتابوں کے متعلق بحث کرنا پسند ہے۔ سہاگ رات جمیل کا سلوک کس قدر مضحکہ خیز تھا! نجمہ کو یہ یاد کر کے ہنسی آگئی۔ جمیل کا جسم جل رہا تھا۔ اس کے سارے بدن میں آگ سی لگی تھی۔ ایک عجیب وحشت کے عالم میں وہ بوسوں کی بارش برسا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ، رخسار پہ، گردن پہ، بالوں پہ اپنے جلتے ہوئے ہونٹ جمائے ہوئے گویا ان کا سارا رس چوس لے گا۔ لیکن چڑھتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس کے مضطرب ہونٹوں سے کتنے غیر رومانی جملے نکل رہے تھے۔ "تم نے بی اے میں کون سے سبجکٹ لئے تھے؟" "تمہیں کس سے زیادہ دلچسپی ہے فلسفہ، سوشیالوجی اکنامکس؟ لٹریچر؟ تم پاکستان کی حامی ہو یا اکھنڈ ہندوستان کی؟" نجمہ کچھ جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہی تھی یہ کیسا آدمی ہے۔ حرکات سے اتنا Passionate معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باتوں سے اتنا غیر رومانی! اس وقت نجمہ کے دل میں کتنے ارمان کتنی امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ کتنے دن اس نے اس آنے والی رات کے تصور میں گذارے تھے۔ اس نے جمیل کی تصویر دیکھی تھی۔ فوٹو میں وہ کتنا رومانٹک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بادام کی سی آنکھوں سے رومانیت چھلکی پڑ رہی تھی۔ وہ حسین تراش کے ہونٹ جن کے کونوں پر ہلکا سا خم تھا رومان کے رس میں بھیگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان خوبصورت رومانی ہونٹوں سے اپنے حسن کی تعریف اور جمیل کا والہانہ اظہار محبت سننے کے لئے بے تاب تھی اس کی بجائے یہ خشک باتیں۔ وہ مایوس ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن اسے معلوم

ہو گیا کہ جمیل حقیقت میں شاعر مزاج اور رومانی ہے دوسری صبح جب نجمہ نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں ساس نے یونہی چوری چوری ذراسی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنا چاہا۔ رات کو فرطِ شرم سے وہ اس کی صورت بالکل نہ دیکھ سکی تھی۔ آنکھیں کھلتے ہی۔ اللہ! جمیل اس پر جھکا ہوا اس کا چہرہ تک رہا تھا! اس کی آنکھوں میں شوق کی دنیا تھی۔ جب نجمہ نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سبز ہیں اور پلکیں بہت لانبی نوکیلی اوپر کو مڑی ہوئی ہیں کتنی خوبصورت تھیں وہ آنکھیں خصوصاً اس لمحہ جب ان میں شوق کی دنیا تھی لیکن جمیل پیار میں ڈوبی ہوئی بے تاب آواز میں اس کی آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا۔ کتنی خوبصورت ہیں تمہاری آنکھیں! کتنی سیاہ، رسیلی، مدبھری۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اتنی حسین آنکھیں کبھی نہ دیکھی تھیں...... نجمہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لی تھیں جمیل نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔ "اوپر دیکھو، میری جان، دیکھو، میری طرف دیکھو، میں کیسا ہوں؟ میری صورت پسند آئی تمہیں؟ مجھے تو تمہاری صورت اتنی..... پھر وہ رنگین لفظوں میں شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ اس کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ کبھی اس کا کوئی خاص پوز، یا خاص ادا دیکھ کر وہ بے اختیار کوئی شعر پڑھ دیتا اور نجمہ کو بے حد تعجب ہو رہا تھا کہ جمیل نے رات ایسا سلوک کیوں کیا تھا۔ چند دنوں بعد اس نے ہنستے ہوئے جمیل سے پوچھا تھا تم نے سہاگ رات کیوں ایسی باتیں کیں۔ وہ کونسا موقع تھا پوچھنے کا۔ تم نے کونسے سبجکٹس لئے تھے؟ تمہیں کس سبجکٹ سے دلچسپی ہے۔ پہلی رات جب ہمارے

سینوں میں تمنائیں مچل رہی تھیں۔ یہ غیر رومانی باتیں کتنی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھیں۔"
جمیل نے جھینپتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "جس وقت میرے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ تمہیں کیسے بتاؤں پیاری! میرے دل پہ کیا گذر رہی تھی۔ میں اپنے آپ پر کتنا جبر کر کے یہ جملے کہہ رہا تھا۔ میں تمہارے حسن سے مسحور ہو گیا تھا میری آنکھیں تمہارا حسن پی رہی تھیں۔ میں بے خود ہوا جا رہا تھا۔ میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا۔ کہ تمہارے حسن کی تعریف کروں۔ تمہیں بتاؤں تم نے مجھ پر کیسا جادو کر دیا ہے ایک ہی رات میں تم نے میرا دل کیسے چھین لیا ہے.........
.........تم میرے دل میں کیسے سما گئی ہو۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ شاید ایک بلا کی ذہین گریجویٹ لڑکی اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتی۔ اس سے ایسی باتیں کرنی چاہئیں جس میں دل سے زیادہ دماغ کا دخل ہو"...... تو وہ اپنے آپ کو اس لئے روک رہا تھا کہ وہ "ذہین" تھی! اُف! جمیل! جمیل!! کیا سہاگ کی رات بھی وہ ایک بلا کی ذہین گریجویٹ لڑکی تھی؟ جمیل کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ اس رات وہ محض عورت تھی عورت! اس رات وہ "بلا کی ذہین" لڑکی سرتاپا نسوانی فطرت میں ڈوبی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ایک ذہین دماغ نہیں ایک جذباتی دل لئے جس میں ہزاروں امنگیں مچل رہی تھیں؟ لیکن جمیل نے صرف اسی ایک رات ایسا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کتنی بے تابی اور گرم جوشی سے محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ کیسی شاعرانہ وارفتگی سے اس کے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا۔ "تم کو پتا ہے میری جان،

مجسم شعر!" "تم مینا ہو نجمی! ایک خوبصورت بلوریں صراحی جس میں رنگین شراب جھلک رہی ہے۔" "میری نجمی! تم ایک نیم وا کلی ہو۔ وہی حسن، وہی معصومیت، شرم بھی، خودنمائی بھی۔" کبھی وہ اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تحسین آفریں نگاہوں سے دیکھتا اور پیار سے کہہ اٹھتا۔ "چودھویں کے چاند"۔ جب چاندنی چھٹکی ہوتی وہ صحن میں پھولوں کی کیاریوں کے پاس جا بیٹھتے وہ چاند کو پھر اسکی صورت کو دیکھ کر کہتا ع

"فلک کے چاند ہم نے بھی زمیں پہ چاند دیکھا ہے!"

ایک دن بادل گھر آئے تھے۔ کالی کالی گھٹاؤں میں چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ وہ جمیل کی گود میں چاند پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ایک سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چاند دھیرے دھیرے چھپ گیا۔ وہ جلدی سے جمیل کی طرف پلٹ کر بولی۔ "دیکھو، چاند بادلوں میں چھپ گیا!" وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کتنی بے ساختگی سے بولا تھا۔ "نہیں تو، کہاں گیا؟ یہ دیکھو چاند میری گود میں ہے۔"

"جانی! تم ایک دیوی کی طرح حسین ہو۔ جی چاہتا ہے تمہیں کوئی بھی کام کرنے کو نہ کہوں۔ بس تم یونہی سہری پہ بیٹھی رہو۔ اور میں تمہاری پوجا کئے جاؤں۔"

ان کے کمرے کے بلب کا سوئچ (Switch) برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ ایک رات شاید کسی نے بھول کر سوئچ بجھا دیا۔ یکایک کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ جمیل نے پوچھا تھا۔ "تمہیں معلوم ہے نجمی! انہوں نے کیوں روشنی گل کر دی۔"

"نہیں تو" وہ سمجھ نہ سکی تھی۔"اس لئے کہ جہاں تم ہو وہاں اندھیرا نہیں ہو سکتا۔جمیل کے یہ بے ساختہ جملے اسے کس قدر پسند آتے تھے۔

ایک دن وہ آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں پھول لگا رہی تھی۔اس کو خبر ہی نہ ہوئی کہ جمیل چپکے سے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔" وہ تو اپنے حسن سے آپ ہی اتنے مسحور ہیں کہ ہمارے آنے کی خبر تک نہیں۔" وہ چونک گئی جمیل پیچھے کھڑا تھا۔اسکی آنکھیں جھک گئیں۔چہرہ فرطِ شرم سے تمتما اٹھا اور جمیل نے اس کے عکس کو آئینہ میں دیکھ کر کہا تھا۔"تم تو مجسم حسن ہو نجمی!" کتنی دفعہ وہ فرطِ شوق سے کہہ اٹھتا تھا۔" تمہاری آنکھیں! ان آنکھوں میں کتنی شراب جھلکتی ہے! بس پیتے ہی جاؤ۔ کیسے بتاؤں کیا ہیں تمہاری آنکھیں!"

نجمہ کو ایک ایک کر کے جمیل کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔جمیل اس کا جمیل! وہ رونے لگی۔موٹے موٹے گرم آنسو تکیہ پوش میں جذب ہوتے رہے۔ وہ روتی رہی اس کے دل پر جمے ہوئے غم و غصہ کے بادل برس کر چھٹ گئے۔اب اس کا دل ہلکا ہو چکا تھا۔اور اس میں جمیل کے لئے بے پناہ محبت امڈی آ رہی تھی۔دور کسی گھڑی نے تین بجائے۔تین بجے ہیں۔اور وہ اب تک سو نہ سکی تھی۔کیسی منحوس ہے آج کی رات۔یہ رات جو وہ جمیل سے الگ گذار رہی ہے۔وہ جو کبھی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔جب وہ کسی رشتہ دار کے گھر میں مہمان ہوتے اور انہیں مجبوراً رات الگ گذارنی پڑتی۔تو وہ دن بھر اس خیال سے کتنی بے چین رہا کرتی تھی۔شام ہوتے

ہی اس کا دل مرجھا جاتا۔ اداس کھوئی کھوئی سی رہتی۔ اپنے اپنے کمروں میں جانے سے پہلے وہ کسی نہ کسی طرح سب کی آنکھ بچا کر ملتے اور جب جمیل اسے اپنے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے اداس نگاہوں سے اس سے رخصت لیتا۔ "گڈ نائٹ ڈارلنگ" تو اس کا دل بے اختیار بھر آتا۔ جی چاہتا جمیل سے چمٹ جائے۔ "نہیں جمیل، میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔" رات اسے بالکل نیند نہیں آتی۔ اکیلی بستر پر پڑی وہ چپکے چپکے رویا کرتی۔ اور آج وہ خود اپنی مرضی سے...... کیسی منحوس ہے آج کی رات۔ فرشتے اس پر لعنت بھیج رہے ہونگے۔ ہاں بھیجنے ہی کی تو بات تھی۔ اپنے شوہر سے اپنے سرتاج سے روٹھ کر..... وہ بھی اتنی ذرا سی بات پر۔ آخر اس نے کیا ہی کیا تھا۔ بہت دیر تک اپنے بھائی کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اور اس کے پاس نہ آیا؟ اس کے بھائی اتنے عرصے کے بعد گاؤں سے آئے۔ کسی ضروری معاملے پر اس سے بات کرنے اور صبح کی ٹرین سے چلے جانے والے تھے اسی لئے تو وہ ان سے اتنی دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ اتنی چھوٹی سی بات پر وہ روٹھ کر یہاں آگئی تھی؟ وہ چادر پھینک کر اٹھ بیٹھی۔ کھلے دروازے سے جمیل کا پلنگ اچھی طرح نظر آتا تھا۔ ننھے سے نیلے بلب کی ہلکی روشنی اس کے سرہانے کی طرف سے پڑ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی سویا تھا۔ معصوم، پرسکون، پاکیزہ چہرہ، بادام کی سی آنکھیں بند تھیں اور رخساروں پر لانبی پلکوں کے سائے آرام کر رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے پلنگ سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور

آہستہ سے بستر پہ رینگ گئی تاکہ جمیل کی نیند میں خلل نہ پڑے ابھی تکیہ پر سر ٹیکا بھی نہ تھا پیچھے سے بازو بڑھا۔ بلینکٹ اٹھا کر سمیٹ کر اسے کھینچ لیا۔ ایک لمحہ میں اُس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اور ایک تسکین بھری، میٹھی سی، لذیذ سی گرمی کی آغوش میں وہ سو گئی۔

اپنی نگریا!

شاہد نے قفل کھولا اور وہ دونوں آفس روم میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی ایڈیٹر کی آفس —— ایڈیٹر! فیروزی دھاری دار شرٹ اور سرمئی اُونی تپلون پہنے وہ کتنا سجیلا لگ رہا تھا۔ دفتر گھر پہ ہی تھا۔ لیکن آفس روم میں جانے سے پہلے وہ ہمیشہ ڈریس کر لیا کرتا تھا۔ "کیا ہوا اگر دفتر گھر ہی پر ہے۔ میں آفس ہی کو تو جا رہا ہوں" وہ ساکس چڑھاتے ہوئے ہنس کر کہتا۔ "ڈریس کر لوں تو ایک طرح کی پھرتی آجاتی ہے اور میں اچھی طرح کام کر سکتا ہوں۔"

وہ تپلون کی جیب میں ہاتھ رکھے، ایک پاؤں پہ بوجھ ڈالے کھڑا باہر دیکھ رہا تھا کھڑکی سے باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کھلا میدان اور سڑک کے

کنارے شوخ سرخ پھولوں سے لدے گل مہر کے درختوں میں آگ سی لگی تھی۔ شفاف نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بدلیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ بڑی روشن صبح تھی۔ کھڑکی کے دودھیا شیشوں میں سے چھنتی ہوئی ہلکی روشنی میں اس کی سبز آنکھیں نیلی جھلک مار رہی تھیں۔ فیروزی دھاری دار شرٹ اور فیروزی آنکھیں جیسے وہ نیلی دھاریاں ان خوبصورت نیلی آنکھوں سے میچ کرنے کے لئے ڈالی گئی ہوں۔ وہ ایک جذبۂ پرستش کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ شاہد نے کھڑکی کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور نسرین کی آنکھوں میں وارفتگی کی چمک دیکھ کر اچانک اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا .... وہ جب بالکل بچی تھی۔ دس گیارہ سال کی، اور انہیں دنوں اسے کافی شعور آگیا تھا۔ وہ ان دنوں 'پھول'، 'غنچہ'، نہیں پڑھا کرتی تھی۔ بلکہ 'نیرنگِ خیال'، 'ساقی'، اور 'ہمایوں'، 'مدینہ' اور 'انقلاب'، نصراللہ خاں عزیز کے 'سرِ راہے' اور سالک کے 'افکار و حوادث' سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ ان دنوں وہ کس شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی کہ ایڈیٹر ہونا بھی کتنی بڑی بات ہے اسے ایڈیٹر سے — کسی شخصیت سے نہیں ....

.... ایک طرح کی عقیدت سی ہو گئی تھی۔ ایک عجیب طرح کا ایڈمریشن! اور وہ سوچتی تھی۔ جب بڑی ہو گی تو — لیکن کیا اس کے پاس اتنے روپے ہوں گے کہ وہ خود رسالہ نکال سکے؟ یا — لیکن یہاں اچھے رسائل ہیں کہاں کہ وہ ان کے دفتر میں کام کر سکے؟ .... لیکن کبھی کبھی دلی تمنائیں

کیسے، عجیب، انجانے طور پر، بر آجاتی ہیں! وہ اب ایک خوبصورت معیاری رسالے کی آفس میں کھڑی تھی۔ آفس ہی میں نہیں ایڈیٹر کے بازوؤں میں! ان بازوؤں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور نسرین اپنا سر اس کے کشادہ سینے پر رکھے اس سینے کی تسکین آمیز گرمی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاہد نے جھک کر......

لیکن اوہ! ذرا ٹھہریئے۔ یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے۔ کیونکہ بھئی لوگوں کو بہت جلد غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ انسان ہر بات میں بہت جلد برائی سونگھنے کا عادی ہے۔ بہت سے لوگ اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ نہیں، صاحب، نہیں۔ یہ لڑکی ناز نسرین نہ ٹائپسٹ یا سٹینوگرافر تھی نہ اسوسیٹ ایڈیٹر، نہ سکریٹری جس سے ایڈیٹر صاحب...... بلکہ وہ ان کی بیوی تھی۔ کیوں مایوسی ہوئی؟ اور شاہد نے اسے جلدی سے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اب بس کام بہت ہے۔ ہم اسی طرح رومان میں کھوتے رہیں تو کام نہیں کر سکیں گے نازی!" وہ پھرتی سے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ ابھی تک کچھ مدہوش سی تھی بوجھل آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ میز پر انگلیاں بجانے لگا اور شریر چمکیلی نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ "مینا کا!" نسرین نے مصنوعی غصہ سے منہ پھلا لیا۔ "ہاں، میں صرف مینا کا کی طرح ٹمپٹ (Tempt) کرتی ہوں نا۔ تمہاری ذرا بھی مدد نہیں کرتی۔"

"کرتی ہو نا، نازی، سچ، تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو مجھے کتنی دشواری ہوتی، پھر وہ پیار میں ڈوبی آواز میں کہنے لگے۔ "تم صحیح معنوں میں جیون ساتھی ہو، میری نازی، میری ہم ذوق، میرے ارادوں میں، میرے کام میں ساتھ دینے والی!" ایک نشیلی کیفیت کے زیرِ اثر وہ بادامی پپوٹے جھک آئے لانبی گھنی پلکیں جھیل کے پانیوں کی سی سبز پتلیوں کو چومنے لگیں۔ ان خوبصورت بھیگی ہوئی آنکھوں کی مقناطیسی چمک سے کھنچی، میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ پھر میز کے اس طرف آکر شوخی سے خطوں کا پلندہ ان کی طرف پھینکتی ہوئی بولی "ابھی تو کہہ رہے تھے کام بہت کرنے ہیں۔"

"اوہ کتنے خطوط کے جواب دینے ہیں ابھی!" وہ چونک پڑے "ایک دو روز خط نہ لکھیں تو کتنے جمع ہو جاتے ہیں۔" وہ خطوں کو سرسری طور پہ پھر دیکھنے لگے۔ "اس ایجنسی کو مزید پرچے بھجوا دیئے تم نے؟" انہوں نے ایک خط بتا کر پوچھا۔

"بھجوا دیئے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ پھر خطوط دیکھنے لگے۔

شاہد کو کام کا احساس دلا کر وہ خود کسی تصور میں کھو گئی۔ "تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو......" شاہد کے ایک خط کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔ ان دنوں وہ اپنے میکے میں تھی، اور خط آیا تھا۔ "نیا دور" کا تازہ نمبر نکل گیا ہے۔ اور تم جانتی ہو ان دنوں کتنا کام ہوتا ہے۔ ڈھیروں کام سامنے پڑا ہے اور تم یہاں نہیں ہو، یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے بھی کام لینا چاہتا تھا۔ لیکن میری نازی

میری اپنی نازی، تم یوں ہی میرے سامنے بیٹھی رہو۔ تو میں دگنا تگنا کام کر سکتا ہوں صرف تمہاری موجودگی مجھ میں گویا ایک بجلی سی بھر دیتی ہے۔ میں خوشی میں سرشار رہتا ہوں اور کام ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب میرا من اداس ہے، دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے، کام بہت بھاری معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔" لیکن وہ یوں ہی نہیں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ کام کیا کرتی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے۔ کبھی خطوط لکھ رہے ہوتے، مضامین پڑھ کر انتخاب کر رہے ہوتے ٹائیٹل پیج کے لئے ڈیزائن تجویز کر رہے ہوتے۔ رنگوں کی آمیزش پر بحث کر رہے ہوتے، پروف دیکھ رہے ہوتے، اعزازی پرچے بھیج رہے ہوتے۔ خریداروں اور ایجنسیوں کو پرچے پیک کرا کے بھجواتے، آمد و خرچ کا اندراج اور پھر حساب پھر خطوط خطوط ہر روز بیسیوں خطوط! وہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی دلچسپی سے آپ ہی کیا کرتی۔ رسیدوں کی پرانی کتاب بھر گئی تھی۔ وہ چپکے سے انڈین لسنر کی کاپیاں اٹھا لائی، اندر کے پونے پونے صفحے کاٹ ڈالے اور رنگین کلپوں میں منی آرڈر، وی، پی اور رجسٹریوں کی رسیدیں چپکا رہی تھی۔ شاید چپکے سے اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یوں ہی مسکراتی رہی۔" ایسے، یہ سب تم کیوں کرتی ہو، جانی، تھک جاؤ گی، دوسرے کام ہی کیا کم ہیں تمہارے لئے"۔" مجھے پسند ہیں یہ کام" "سچ؟" "ہاں" " شاید عورتیں میکانیکل کام ہی دلچسپی سے کر سکتی ہیں۔ اسی لئے شاید سٹینوگرافرس اور سکریٹری زیادہ تر لڑکیاں ہی

ہوتی ہیں۔ میں کبھی بڑا آدمی ہو جاؤں، تو تمہیں کو سکرٹری بناؤں گا، بنو گی؟" شاہد نے ہلکے سے اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔ وہ خوشی سے معمور آواز میں بولی۔ "میں رائٹے کی بیوی یقین رائٹے کی طرح میں شارٹ ہینڈ سیکھوں گی۔ ٹائپ کرنا سیکھوں گی اور پھر ......" "اور میری نازی، نازی" شاہد نے اسے گھما دیا۔ پھر یک دم سے اسے چھوڑ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ اور بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "آخر کیوں؟" نسرین نے پوچھا۔ "تم تو ایسے یقین سے کہہ رہی ہو جیسے میں سچ مچ بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ میں تو یونہی مذاقاً کہہ رہا تھا۔ اچھا اب آؤ، دیکھو مختلف رنگوں میں پرنٹ کرا کے چند کور پیج لے آیا ہوں، دیکھو کونسی انک (Ink) ٹھیک بیٹھتی ہے"....

وہ یونہی ہنستے کھیلتے کام کیا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی اتنا کام رہتا کہ وہ بالکل تھک جاتے۔ خصوصاً پرچہ نکلنے سے چند دن پہلے اور چند دن بعد تو بہت ہی زیادہ کام رہتا، وہ چھوٹے سے ایڈیٹر تھے۔ پرچہ ابھی ابھی نکلا تھا۔ ان کے دفتر میں نوکر اور کلرک اور منیجر اور ایڈیٹر۔ بعض سرمایہ دار "ایڈیٹر" تو ایڈیٹ بھی دوسروں سے کرواتے ہیں۔ نہیں تھے بہت سارا کام وہ خود ہی کیا کرتے۔ شاہد اور وہ۔ "نیا دور" کو انہوں نے محنت سے پالا پوسا، پروان چڑھایا، شاید اسی لئے انہیں "نیا دور" سے اس قدر محبت تھی!

آج کل، آج کل کے وعدوں سے پریشان کر کے کاتب آخر کار کتابت ختم کرتے۔ طباعت کے لئے پھر وہی وعدے۔ آخر تنگ آ کر وہ ان دنوں کورٹ

کورٹ جانا بھی چھوڑ دیتا اور دن بھر دونوں پریس کا چکر کاٹتا رہتا۔ کور پیج کی پرنٹنگ ایک پریس میں ہوتی تھی اور فارموں کی کتابت اور طباعت دوسرے پریس میں۔ ایک بستی میں تھا تو دوسرا چھاؤنی میں! میلوں دور۔ "کور پیج چھپ گئے؟" "نہیں" "کور کارڈ اور بلاک اور اشتہارات کے مضمون تو ہفتوں پہلے آپ کو دیئے گئے تھے!" "کورس کاٹ دیئے گئے" "صرف کاٹ رکھے ہیں؟ بلاک نہیں چھپے؟" "نہیں" "اور اشتہار؟" "اشتہار بھی نہیں" اور وہ سر پکڑے وہیں بیٹھ جاتا۔ جب تک پورے کور تیار نہ ہو جائیں وہ وہیں بیٹھا رہے گا۔ ٹائیٹل پیج کے سرے پر بلاکس چھاپے جاتے۔ پھر درمیان میں کس طرح کا گراؤنڈ یا نہ چھاپا جائے۔ اور یہ کس رنگ کا ہو، اس کے بازو اور نیچے کس طرح کے لائنس ہوں، کتنی لکیریں باریک ہوں اور کتنی موٹی، یہ کس طرح سے سیٹ کی جائیں۔ فلاں فلاں عبارت کے لئے کس نمونے کے اور کتنے موٹے ٹائپس چنے جائیں اور فلاں عبارت کون سے رنگ کی انک میں چھپے، سب کچھ بڑے انہماک سے آپ ہی انتخاب کر کے چھپواتا تھا پھر سائیکل تیزی سے چلاتا وہ چھاؤنی جا پہنچتا۔ "کتنے فارم چھپے ہیں؟" "تین" پرسوں بھی تین ہی چھپے تھے! اس دن سے کچھ نہیں کیا، آپ نے وعدہ کیا تھا آج تک دو اور فارم چھاپ دیں گے" "وہ دو فارم جو آپ دوسرے کاتب کے پاس لکھوا لائے تھے، بالکل خراب تھے پتھر پہ چڑھائے تو جملے کے جملے اڑ گئے تھے۔ عبارت بالکل پڑھی نہ جا سکتی تھی۔ آپ نے اس کے پاس کیوں لکھوایا؟ وہ

اچھا کاتب نہیں ہے اور کاغذ پر گنجی بھی برابر نہیں چڑھائی تھی۔" دو فارم اڑ گئے۔
پھر سے لکھوانا ہوگا انہیں!" آخری دو فارموں کی کتابت ختم کر دی آپ نے؟"
"ہاں ختم ہو
گئی" "تو ان دو فارموں کی کتابت بھی آپ ہی کر دیجئے۔ کل ہی شروع کر دیجئے،
میں گھر جا کر آج ہی سو روپے بھجوا تا ہوں"۔ وہ فارم اڑ گئے تو دوسرے کیوں نہ چھپوا دیئے"
"دیکھئے بہت دیر ہو رہی ہے" "کل آپ ہی کا کام کریں گے۔ اب بہت دن جا چکا ہے"
"آج کم سے کم ایک فارم تو چھاپ دیجئے......."
"بڑی مشکل سے ایک فارم چھپوا کے آیا ہوں، نازی،" وہ آتے ہی صوفے پر گر
پڑتا اور مایوسانہ لہجہ میں کہتا۔ دن بھر کی سائکلنگ سے تھک کر چور، پسینہ میں شرابور
تھکا ہوا جسم اور تھکا ہوا دماغ لئے! "ابھی آدھا کام بھی نہیں ہوا، پھر کل جانا ہوگا۔ یہ
پریس والے بھی کتنا دق کرتے ہیں" "بستر لگا دوں گی، چل کر کچھ دیر سو رہو، بہت تھک گئے
ہو" "نہیں بستر پر سوؤں گا تو بہت دیر سو جاؤں گا۔ یہیں چند منٹ آنکھیں بند کئے پڑا
رہونگا، نیند لگ جائے تو اٹھا دینا۔ آخری دو فارمس لے آیا ہوں۔ پروف دیکھنا ہے
اٹھا دوگی نا؟ کل نہ لوٹا دوں تو چھاپنے میں اور دیر کر دیں گے۔ کتنا شدید درد ہو رہا ہے
سر میں" وہ اسے نہیں اٹھائے گی، وہ سوچتی اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگتی۔
شاہد کو نیند سی آجاتی۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ "میں بہت دیر سو تو نہیں گیا"
"ارے دس منٹ ہی تو ہوئے ہیں۔ تم سو جاؤ، میں کسی سے پڑھوا کر تصحیح کر دونگی

"نہیں نازی، جانے وہ کس طرح پڑھیں گے۔ کاما، ڈاٹس، حرف کے نقطے اور بہت ساری چیزیں مثلاً مسودے میں کتنی جگہ چھوڑ کر دوسرا حصّہ شروع کیا گیا ہے یہ سب کچھ دیکھنا چاہیئے۔ تم پڑھو تو میں تصحیح کر دوں گا۔ بیگ میں سے فارم نکال لو، مسوّدے بھی وہیں ہیں۔"

اب انہیں رومان کے لیئے پہلے کی طرح وقت نہ ملتا تھا۔ لیکن ان کی محبت اب روحانی طور پر اتنی گہری ہو گئی تھی۔ کہ دفتر میں بیٹھے کام کرتے ہوئے بھی ہر لمحہ اس محبت کا شدید احساس ہوتا۔ وہ متقابل کی کرسیوں پہ بیٹھے ہوتے' ان کے درمیان ایک لانبی سی میز پڑی ہوتی، ہاتھ کام کر رہے ہیں، نگاہیں کاغذوں پہ لگی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسے محسوس ہوتا جیسے اس میز کے اوپر سے ان کے دلوں کے درمیان، محبت کی دھارا بہہ رہی ہے' بہہ رہی ہے' ایک دل سے دوسرے دل کو، پیہم' وہ سر اٹھا کر دیکھتی۔ شاہد کے چہرے پر پسینے کی بوندیں آ جمی ہیں۔ اس کے بال پریشان ہو کر پیشانی پہ آ پڑے ہیں۔ وہ تھکا ہُوا ہے، وہ چپکے سے اٹھ کر اندر چلی جاتی اور چاء لے آتی۔ اس کے بال ہٹا کر ایک مادرانہ شفقت سے اس کی پیشانی چوم کر کہتی "چاء پی لو، بہت تھک گئے ہو" وہ چپکے سے اس کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیتا۔ چاء پی کر وہ تازہ دم ہو جاتے۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ نسرین کو یہ زندگی بہت پسند تھی.......

"ٹھلے ایسے کوئی ضروری تو نہیں"۔ شاہد نے خطوں کو پرے رکھتے ہوئے کہا۔
"آئندہ پرچے کی ترتیب دے دیں گے"۔ "ابھی سے؟"
"ہاں، پچھلا پرچہ نکل کر کتنے دن ہو گئے۔ آج اتوار ہے کل پھر مجھے کورٹ جانا ہوگا۔ اور کاتب کو ان دنوں فرصت بھی ہے، ورنہ درسی کتابوں کا کام شروع ہو جائے تو بڑی مشکل ہو گی۔ اب بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔ آئندہ سے ہمیں ایک پرچہ نکلنے کے پہلے ہی دوسرا مرتب کر کے کتابت کے لئے دینا چاہیئے"۔ انھوں نے کہا۔

"اچھا وہ مضامین والی فائل نکال دو، میں آئے ہوئے مضامین کی فہرست بناؤں گی"۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے یوں ہی ذرا سا پیچھے کو جھک کر المارئی میں سے ایک فیروزی فائل نکال لی، میں نے ہاتھ بڑھا کر فائل لے لی اور فہرست بنانے لگی، وہ مضامین جو انتخاب میں لے لئے گئے تھے۔ پھر وہ مضامین جو زیرِ غور تھے۔ ناقابلِ اشاعت مضامین تو پہلے ہی سے الگ کر کے دوسری فائل میں ڈالے جا چکے تھے۔ فہرست تیار کر کے میں نے ان کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "وہ خطوط ادھر بڑھا دو۔ میں ان کے جواب لکھ دوں"۔
خطوط کی ایسی کیا جلدی ہے۔ تم کل بھی لکھ سکتی ہو، آج مجھے چھٹی ہے، ترتیب دے دیں گے۔ مضامین کی فائل ادھر بڑھا دو۔ میں پہلے یہ اندازہ لگا لوں، مضمون کتنے کتنے صفحوں میں آئیں گے اب تو ہمیں پیپر کنٹرول آڈر کے

تحت ۴۰ صفحوں سے بڑھنے کی اجازت نہیں۔" میں نے فائل دے دی۔
شاہد مضامین نکال کر صفحات گننے لگا۔ تب تک وہ بیٹھی کیا کرے؟
اس نے اِدھر اُدھر دیکھا میز پر کوئی کتاب رکھی ہو تو لے کر پڑھے۔ میز کے آخری کونے پر ننھا سا ایک ریوالونگ شیلف رکھا تھا، دیکھیں اس میں کوئی کام کی کتاب نکل آئے، برنارڈ شا۔ یوری باڈیس پولیٹکل واٹ ازواٹ، جواہرلال نہرو کی گلمپس آف ورلڈ ہسٹری' سچ، ہل فیشر، ہسٹری آف یورپ کتنے دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب تاریخ ہو کر بھی بالکل خشک نہیں معلوم ہوتی! لیکن بھئی اب پالیٹکس اور ہسٹری کون پڑھے گا۔ فرائڈ کا فکاری کیاسل، اس کے بہت سارے حصّے تو اس نے پڑھے ہیں۔ کہیں کہیں اکتا کر چھوڑ دیا تھا، لن یوتانگ کی امپارٹنس آف لیونگ' لیف ان دی سٹارم یہ تو وہ پڑھ چکی ہے۔ تھارن ٹن وائلڈر کی برج آف سان لوئی رے" یہ بھی حال ہی میں پڑھی تھی، الکسی ٹالسٹائی ـــــ روڈ ٹو کیلواری' جان ڈاس پاس U.S.A.، افوہ! ٹریلوجیس! اب فی الحال تو اسے کوئی شارٹ سٹوریس کی کتاب چاہیئے تھی شاہد کے صفحات دیکھ کر اندازہ لگانے تک ایک چھوٹا سا افسانہ پڑھ سکے وہ پیچھے کے شیلفوں میں سے کوئی کتاب لانے کے لئے اٹھی تو بید کے ٹرے کی اوٹ میں میز پر تازہ ساؤنڈ، پڑا دکھائی دیا، ٹائیٹل پیج پر ڈیاز لنگ نیو فائنڈ بیگم پارہ کی تصویر تھی۔ اس نے ساؤنڈ اٹھا لیا اور یونہی ورق الٹ پلٹ

کر تصویریں دیکھنے لگی۔

"تصویریں کیا دیکھ رہی ہو، نازی، عباس کا آرٹیکل پڑھو" جانے انہوں نے کیسے دیکھ لیا، مجھے تصویریں دیکھتے۔

شاہد احمد عباس کے مضامین کو اتنا پسند کرتا تھا۔ "فارفنٹی میں آف سلور" طرح کی چیزیں کون نہیں پسند کرے گا۔ وہ خود بھی ساؤنڈ میں احمد عباس کے مضامین بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ لیکن ساؤنڈ ملتے ہی اسے تصویریں دیکھنے کی بڑی بیتابی رہتی۔ "فلم انڈیا بھی کیوں نہ خریدیں؟" "فلم انڈیا اب یوں ہی سا پرچہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کبھی اس میں بھی بڑے اچھے مضامین ہوا کرتے تھے" "لیکن اس میں بہت سے آرٹ پلیٹ ہوتے ہیں اور بڑی بڑی تصویریں۔"

"تصویریں؟ او نازی تم تو ابھی بچی ہو!" تصویروں سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ بھی غور کئے بغیر کہ ٹائٹل پیج پر کس کی تصویر ہے، عباس کے آرٹیکل پر ٹوٹ پڑتا۔ اور صبا کے بارے میں کہتا ہوں یہ صبا بھی عباس ہی ہوں گے، نازی، دیکھو تو سائل کتنا ملتا ہے اور Saba یوں ہی Abbas کا الٹا ہے" "واقعی کیا لکھتے ہیں عباس!" وہ ہمیشہ بمبئی کرانیکل کا آخری صفحہ اس کے سامنے پکڑ کر کہتا۔ نسرین عباس کا مضمون پڑھ چکی تھی۔ تصویریں دیکھ کر اس نے ساؤنڈ میز پر رکھ دیا۔ میز پہ چیزیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ مختلف Seals ایک پیڈ لیٹر ہیڈس پنسلیں، فاؤنٹن پین، رسید اور بل کی چھوٹی چھوٹی کتابیں، پنچنگ مشین

چند فائلیں، گوند کی بوتل اس نے بید کے ترے میں تازہ خطوط رکھے اور دوسری چیزیں بھی قرینے سے رکھنے لگی۔

"مجھے بھی چند مضامین دو۔" میں نے سب چیزیں اپنی اپنی جگہ رکھ کے پوچھا۔

"نہیں تم اندازہ نہیں لگا سکو گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"چپ بیٹھی رہو رانی۔" انہوں نے بڑی ہی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ اور ان بلوریں نینوں میں رس بھر آیا۔ جگمگاتی سبز تیلیوں پر جھکی ہوئی وہ گھنی پلکیں! میں سفید و سبز و سیاہ کے اس خوبصورت سنگم کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی۔

پھر وہ ریشمیں پلکیں جھپک گئیں اور سبز کانچ کی سی تپلیاں بادام کے سے پپوٹوں میں چھپ گئیں اور نسرین کی نگاہیں ان پر سے ہٹ کر ادھر ادھر کمرے میں بھٹکنے لگیں۔ اُف وہ کتنا ٹھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا یہ کمرہ کتنا سارا سامان یہاں لاکر ٹھونس دیا گیا ہے۔ بید کا سیٹ بھی، کتابوں کے شیلف بھی، پہلے کتنا کشادہ معلوم ہوتا تھا یہ کمرہ۔ اس میں صرف دفتر کا سامان تھا۔ ایک چھوٹے سے دفتر کا سامان۔ دو میزیں ایک لانبی، ایک ذرا چھوٹی۔ اور ان کی میزوں کی دونوں طرف رکھی ہوئی چار کرسیاں۔ ایک کونے میں چند ریم سفید کاغذ اور کردو کڈ ائل کارڈ اچھی طرح ڈھکے ہوئے دوسرے دو کونوں میں دو بڑے سٹانڈ۔ جن میں

بید کے گہوارے سے لگے تھے۔ ایک میں اردو رسائل کی فائلیں رکھی تھیں دوسرے میں ہندوستان کے انگریزی اخباروں اور رسائل کے ہندوستان کے سبھی اچھے اردو رسائل کی فائلیں ان گہواروں میں رکھی تھیں۔ "نیا دور" اتنے اعلیٰ معیار اور اچھے پروڈکشن کا رسالہ مانا جاتا تھا کہ دو تین بہت اچھے انگریزی رسائل بھی اس کے تبادلے میں آتے تھے۔ پاس ہی The Hindu تو دہ پڑا تھا معمولی رسائل اور اخبارات ایک طرف رکھ دیئے گئے تھے۔ چوتھے کونے میں ایک چھوٹی سی الماری جس میں مشہور لکھنے والوں، دوسرے مضمون نگاروں، ایجنسیوں اور خریداروں کے خطوط کی فائلیں، مضامین، ناقابلِ اشاعت مضامین پچھلے پرچوں میں شائع شدہ مضامین کی فائلیں خریداروں کا رجسٹر، رسیدوں کی کتابیں، اکونٹ بکس، لیٹر ہیڈس اور نیچے کے خانے میں "نیا دور" کے پچھلے پرچوں کی دو دو کاپیاں رکھی تھیں۔ لانبی میز کے نیچے پٹوں کے پاس ردی کی ٹوکریاں تھیں۔

"دیکھو نازی میرا خیال ہے اس دفعہ نظم سے پہل نہ کی جائے چھوٹتے ہی احمد علی کا مضمون دے دیا جائے کیوں؟"

اوہ! انہوں نے ترتیب شروع کر دی۔ میں نے چونک کر کہا۔ "ہاں مضمون ہی سے شروع ہو تو اچھا ہے۔"

"پھر، ٹھہرو تمہیں کیسے معلوم ہو، فہرست کی ایک اور کاپی تمہارے لئے بنا دیتا ہوں۔"

اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے یاد ہیں سب مضامین کے نام۔ میرے خیال میں اس کے بعد فیض احمد فیض یا اختر انصاری کی نظم ...."

"نہیں اختر انصاری کی یہ نظم تو ان پر مضمون کے ساتھ آئے گی اور ان کی سب نظمیں ایک ساتھ آئیں تو اچھا ہے۔ ایک یہاں، ایک وہاں ڈالی جائے تو ترتیب میں بڑی بے سلیقگی نظر آئے گی، فیض کی نظم ٹھیک رہے گی۔ پھر؟"

"کرشن چندر کا......"

انھوں نے میری بات کاٹ دی۔" اوہ نازی! تو سب بڑے بڑے ناموں کو شروع میں رکھنا چاہتی ہو، ترتیب میں ناموں کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، مشہور لکھنے والوں کے مضامین تو سب پڑھتے ہی ہیں، خواہ وہ شروع میں چھپے ہوں یا درمیان میں یا آخر میں۔ ترتیب میں محض ناموں کا خیال نہیں رکھنا چاہیے،" "ٹھہرو میں پہلے ایک رف ساخاکہ بنا لیتا ہوں۔ پھر ترمیم کرنا ہو تو غور کریں گے۔ شاہد محض یوں ہی ترتیب نہیں دیتا تھا۔ کتنا سلیقہ ہوتا تھا اس کی ترتیب میں! مشہور اہلِ قلم بھی اس کے سلیقہ اور حسنِ ترتیب کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ "کیا کہوں آپ کو پرچہ مرتب کرنے کا ایسا سلیقہ ہے"۔ "نیا دور" کے مضامین تو بلند پایہ ہوتے ہی ہیں، لیکن آپ اس میں اندازِ ترتیب سے نئی جان، نئی بیداری، نیا حسن پیدا کر دیتے ہیں"۔ ہاں شاہد کے اندازِ ترتیب میں ایک حسن، ایک خاص ذوق جھلکتا تھا۔ وہ کہیں ایسے مضامین ایک کے بعد دیگر رکھتا تھا جن میں بالکل

تضاد ہو۔ اگر ایک افسانے میں بالکل اونچی سوسائٹی کی زندگی کی تصویرکشی کی ہو۔
تو اس کے فوراً بعد ہل چلاتے ہوئے، پسینہ بہاتے ہوئے لیکن اپنے خون پسینے
سے سینچے ہوئے کھیت کے لگلے ہوئے اناج سے محروم، فاقہ کش کسان کی
تصویر پیش کرتی ہوئی، ایک درد بھری نظم کو جگہ دے گا۔ تاکہ اس تضاد سے
اثر اور زیادہ پیدا ہو، کبھی ایسے بہت سے مضامین کی ایک ساتھ ترتیب دیتا
جن میں ربط اور ہم آہنگی ہو۔ اور ان میں ایک دوسرے سے گذرتی ہوئی ایک
دھارا سی بہتی چلی جائے۔ کبھی ذرا ملتے جلتے موضوعات پر الگ الگ طریقے
سے لکھے گئے، یا الگ الگ نظرئے پیش کرتے ہوئے مضامین یا افسانوں کی
اس طرح ترتیب دیتا جیسے ایک ہی مقام سے نکل کر چاروں طرف بکھرتی ہوئی
ایک پھلجھڑی سی چھوٹ جائے، کبھی ایسی ترتیب کہ غضب کا تنوع ظاہر ہو،
کبھی یہ ترتیب قوس و قزح کی شکل اختیار کر لیتی وہ دو دو افسانوں یا نظموں کے
درمیان ایک ایک ایسی نظم لا دیتا جس میں اپنے آگے اور پیچھے کے دونوں
مضمونوں کا رنگ ملا ہو۔ گو وہ دو مضمون اپنی اپنی جگہ بالکل الگ ہوں جیسے قوس
قزح کے کنارے کمان تانے ہوئے اپنے دونوں طرف کے رنگوں کے
کناروں میں مدغم ہو جاتے ہیں گو درمیان میں الگ ہی رنگ پھوٹ رہا ہوتا ہے
میں جانتی تھی اب وہ پھر بڑے انہماک سے نظمیں وغیرہ پڑھ کر بڑی سوچ
بچار کے بعد خاکہ تیار کریں گے اتنی دیر تک پھر خاموش بیٹھنا ہوگا؟ میں اندر

اٹھ کر جانے والی تھی کہ انہوں نے پوچھا۔

اس دفعہ ہم نے دوسری زبانوں کی کہانیوں کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔ ...
ماستی کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے کیا؟

"مکمل تو کیا، آدھا بھی نہیں کیا، اتنا طویل ہے وہ افسانہ میں نے اکتا کر
چھوڑ دیا، آئندہ نمبر کے لئے ضرور کر دوں گی۔"

تو پھر اس دفعہ کونسی کہانیاں شامل کی جائیں؟ میں نے یہیں کے دو تین
آدمیوں سے چند ترجمے کروائے ہیں۔ لیکن ترجمے خراب ہوتے ہیں۔ تم دیکھ کر
تصیح کر دو تو میں شامل کر لوں گا۔

"میں نہیں کروں گی تصیح، میں نے پڑھا ہے انہیں" میں جھنجھلا گئی۔ جملہ جملہ
بدلنا پڑے گا۔ از سر نو ترجمہ کرنا ہوگا؛ اس سے تو بہتر ہے اوریجنل دیکھ کر میں
خود ہی ترجمہ کر دوں۔"

"لیکن، نازی، وہ نارویجین کہانی کا ترجمہ کر دیا ہوتا چھوٹی سی ہے نا!"

"کونسی نارویجین کہانی؟"

"Knut Hamsun کی 'دی کال آف لائف'۔"

"ہاں وہ ضرور کر دوں گی، کنوٹ ہامزون کو نوبل پرائیز ملا تھا؟"

"ہاں ...... اور سنو کوئی اور بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ تمہاری نظر
میں جن کا ترجمہ ہو سکے ......"

"ترجمے کے لئے میں نے چند کہانیوں کا انتخاب کر رکھا ہے۔ آسٹرین آتھر سٹیفنس نہ دیگ کا، "دی لیٹر فرم ان ان نون اُومن"، لیام او فلارٹی کی "دی ریپنگ رلیس"، لیام او فلارٹی امریکن ہے؟ میں بھول رہی ہوں......"

"نہیں، آئرش!"

"اور لوئی پیرانڈیلو کے مجموعے میں "دی اینزیٹی" مجھے پسند آئی۔ تم کہہ رہے تھے یہ اطالوی آتھر نئے ادیبوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن کیا ہرج ہے مجھے یہ افسانہ اتنا اچھا لگا اسی وقت ترجمہ کرنے کا خیال ہوا۔ لیکن ہے بہت طویل۔ پہلے اس اڑیا کہانی کا ترجمہ کر دوں؟ چھوٹی سی ہے اڑیسہ کی کوئی کہانی ہم نے اب تک پیش نہیں کی۔"

"ہاں، ہمیں ہندوستانی زبانوں کی طرف کچھ اور توجہ دینی چاہیئے۔ زیادہ تر یوروپی ادب ہی پیش کرتے رہے ہیں اب تک۔ یہاں کی دوسری زبانوں میں بھی ترقی پسند رجحانات آ چلے ہیں۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پرسوں میں نے کھانڈے کر کی کہانی پڑھنے کو دی تھی۔ پسند آئی نہیں؟ کھانڈے کر، مرہٹی ادیبوں میں بہت مشہور رہے ہے۔"

"ہاں پسند آئی تھی۔ دو الگ قصّے لیکن ایک مرکزی خیال، ایک ہی تار میں منسلک......" اور بنگالی کہانیوں میں سے کونسی ڈالیں؟" ———

"دس ارتھ از ناٹ یورس"؟ بودھا دیو بوس کی "ڈسپیبر؟" وہی جو لانگ مینس مِسلینی میں چھپی تھی۔ پر بودھ کمار سانیال کی 'پرینتی' کتنا اچھا نفسیاتی تجزیہ ہے! اور "تِم" پریم نند متراکی۔ بس ایک فہرست ہی گنتی چلی جارہی ہے۔ کتنا مشکل ہے بنگالی کہانیوں میں انتخاب کرنا! سبھی اچھی ہیں۔ ان کا افسانوی ادب واقعی Mature ہے' زندگی ہوتی ہے بنگالی افسانوں ہیں' اور فن' پروپیگنڈا نہیں نصائح اور تقریروں کے ذریعہ نہیں۔ واقعات کی تفصیل اور کرداروں کے تجزیہ سے اپنا مقصد بیان کرتے ہیں۔ جذباتی رو میں بہہ نہیں جاتے' ایسی افراط تفریط بھی نہیں ہوتی کہ ایک ہی پہلو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ کتنا تناسب اور توازن ہوتا ہے۔ زندگی کا تناسب اور توازن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یو آر اے ماروِل ڈارلنگ!" میں چونک پڑی میں تو کچھ ایسے جوش میں کہے جارہی تھی' میں نے غور ہی نہیں کیا وہ کیسی تحسین آفرین نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ہونٹ بھینچے۔ میں شرما گئی اور بات ٹال کر پوچھا۔ "اچھا تو کس کا ترجمہ کروں میں اس نمبر کے لئے؟"

"میں نہیں چاہتا، تم اتنا وقت ترجموں میں صرف کرو۔ تم میں تخلیقی صلاحیت ہے۔ ترجموں میں تمہارا بہت سا وقت بیکار جارہا ہے۔

"تم افسانے تو بالکل نہیں لکھ رہی ہو آج کل؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن لکھوں کس پر' میرا مشاہدہ تو اتنا محدود ہے' بچپن ہی سے اتنے سخت

پردے میں رکھا تھا، سرپھرا کے ذرا آٹو بیاگرافک افسانے ہی تو لکھ سکتی ہوں۔"
"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے اس طرح کے افسانے لکھنا کمتری کا باعث ہے۔
دنیا کے لٹریچر میں کتنی بہترین چیزیں آٹو بیاگرافک ہی تو ہیں' واقعات کی سچائی اور
جذبات و احساسات کی گھٹن یا ہیجانوں کی صحیح عکاسی اس میں آسانی سے ہو سکتی
ہے ......"

"ہاں ٹھیک ہے لیکن میدان ہی کچھ محدود ہو جاتا ہے۔"
"ایک حد تک۔ لیکن ہم توجہ دیں تو بہت سارے موضوع مل سکتے ہیں'
کیوں کیا ایک فرد کی زندگی میں اتنا مواد نہیں کہ بیسیوں افسانے بن سکیں؟"
"اور اگر واقعات ایسے چنے جائیں جن میں بہتوں کی زندگی کا عکس ہو یا
اس کے اندر سے کوئی Basic Human elment جھلکتا نظر آئے تو
خواہ پس منظر ایک ہی فرد کی زندگی کا کیوں نہ ہو افسانہ میں اجتماعی رنگ
آجاتا ہے ...."

"ارے تم نے میرے منہ سے بات چھین لی' میں اب بالکل یہی کہنے والا
تھا' جب ہم بحث کر رہے ہوتے ہیں تم کبھی کبھی کیسے وہی بات کہہ دیتی ہو جو
میں کہنا چاہتا ہوں۔"

"دل سے دل کو راہ ہوتی ہے' کی یہ ایک "ترقی پسند" صورت ہے۔"
ہم دونوں پہ بری طرح ہنسی کا دورہ پڑا۔

بہ مشکل ہنسی تھام کر میں نے پوچھا۔ "اچھا تو اس دفعہ کون سے ترجمے ہونگے؟"
شائع شدہ ترجموں میں سے دو بہت اچھے چن لیں گے کیوں؟ ہم نے اب تک چین کی کوئی کہانی پلش نہیں کی ہے۔ "یڈ گر سنو" کی "لیونگ چینا" کی سبھی کہانیاں اچھی ہیں اور تمنائی نے بہت اچھا ترجمہ کیا ہے ان کے "زندہ چین" میں سے ایک لیں گے۔ اور کوئی دوسری کہیں اور سے۔ آئندہ نمبروں کے لئے ہم شمالی ہند کے اچھے مترجموں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ افسانوں کا انتخاب تو ہم ہی کریں گے۔ ہر ملک کے منتخب شدہ افسانوں کے مجموعے جو ہیں ہمارے پاس"
دونوں ترجموں کا نام فہرست کے نیچے لکھ کر وہ پھر کاغذوں پر جھک گئے۔
اور نسرین خطوط میں سے جو زیادہ ضروری تھے انہیں نکال کر جواب لکھنے لگی۔
میں نے چھٹواں خط لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔ "ذرا دستخط کر دو اس پر۔"
"کیوں"؟ تمہاری طرف سے لکھا ہے وہی پبلشر کے خط کا جواب"
دستخط کر کے انہوں نے میرے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے خاکہ بنا لیا ہے پڑھ کر سناؤں؟"
"ارے اتنا جلد" میں متعجب ہو گئی۔ "تمہاری ترتیب تو......"
"دھارے کی طرح بہتی ہے پھلجھڑی کی طرح بکھر جاتی ہے، فوارے کی طرح چھوٹتی ہے، قوس و قزح کے رنگوں میں بٹ جاتی ہے کیسے کیسے شاعرانہ نام دے رکھے ہیں تم نے لیکن اس دفعہ مضامین ہی کچھ ایسے ہیں کہ کسی خاص سلیقہ

سے ترتیب دینا ممکن نہیں۔ میں نے یوں ہی ترتیب دے دی ہے سنو گی؟" "اچھا"
تمہارے کہنے کے مطابق میں نے پہلے احمد علی کا مضمون رکھا ہے، پھر
فیض احمد فیض کی نظم پھر کرشن چندر کا افسانہ......" وہ پڑھتے گئے۔
میں غور سے سن رہی تھی۔ ایک نظم کا نام سن کر میں نے چونک کر پوچھا۔
"یہ نظم؟ مجھے ایسے یاد پڑتا ہے۔ یہ معمولی تھی ادھر لاؤ پھر پڑھ کے دیکھوں
......" "معمولی ہے"
پھر بھی اتنی ساری معمولی نظمیں جو موصول ہوئی ہیں، ان میں غنیمت ہے۔"
"غنیمت؟ کیا "نیا دور" کا معیار غنیمت پر اتر آیا ہے؟"
"لیکن نازی، اس دفعہ اچھی نظمیں بہت کم موصول ہوئی ہیں"
"کم ہیں تو شائع شدہ نظموں میں سے بہت اچھی چن کے ڈالیں جیسے پہلے نمبر دل
میں کیا تھا"
"لیکن مطبوعہ چیزیں حتی الامکان کم...... اس دفعہ دونوں ترجمے بھی تو مطبوعہ
ہیں" پھر انہوں نے فہرست پڑھنی شروع کی۔" پھر یہ نظم۔"
"ارے یہ بھی معمولی ہے۔ ایک سے دو معمولی چیزیں شامل ہوں تو مجموعی اثر
بھی خراب ہو جائے گا۔ پر وہ بہت دیر تک خاموش رہے۔ آگے پڑھو نا، کیوں، خفا
ہو گئے کیا؟
خفا کیوں ہوں گا، میری نازی، تم تو وہی کہہ رہی ہو جو میں نے بھی محسوس کیا

لیکن مجبوری ہے۔" پھر کیا ہے اس کے بعد؟"

"کھول تو تم اور بھی متعجب ہو گی۔ یہ افسانہ بھی دوسرے درجہ کی چیز ہے لیکن اس مصنف کی بہت ساری چیزوں سے بہتر ہے۔"

دوسرے درجہ کا افسانہ؟ یہ تو اور بھی بری بات ہے، ایک دوسرے درجہ کے افسانے کو "نیا دور" میں جانے دیں؟"

"اگر یہ نکال دیں تو اس نمبر میں اردو کے صرف دو ہی افسانے رہ جائیں گے وہ بھی چھوٹے۔" "دو ہی کیوں۔ ہم نے تو اردو کے بہت اچھے افسانوں کی اتنی لمبی فہرست بنا رکھی ہے "نیا دور" میں شائع کرنے کے لئے؟"

"لیکن حتی الامکان غیر مطبوعہ......"

غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ آخر کیوں؟ ہم نے شائع شدہ چیزوں کے شائع کرنے کی سب ایڈیٹروں اور پبلشروں سے اجازت لے لی ہے نا اور اعلان بھی کر دیا ہے کہ "نیا دور" پنگوِن نیو رائٹنگ کی طرز پر نکالا جا رہا ہے۔ اس میں بہترین مطبوعہ چیزوں کا انتخاب بھی شامل ہوتا ہے اور سبھی مشہور اہلِ قلم نے رسالہ کی اس روش کو کس قدر پسند کیا ہے۔ بلکہ کرشن چندر نے تو لکھا تھا "اگر آپ اردو اور دوسری زبانوں کے ادب سے بہترین چیزیں چن کے پیش کریں تو یہ بھی بجائے خود ایک بہت بڑی خدمت ہو گی۔"

لیکن شاہد احمد صاحب نے لکھا تھا "ملک میں ایسے پرچے کی قدر ہونی مشکل

ہے"۔ اور یہ بہت بڑی حقیقت ہے' نازی' ہم اسے بھلا نہیں سکتے.... مطبوعہ چیزیں ہوں تو اکثر لوگ پرچہ نہیں خریدیں گے۔"

"پہلے پرچے تو بک گئے۔"

"ہاں پہلے تو بک گئے۔ پرچہ نیا تھا۔ شاندار نکلا تھا۔ اس لئے خرید لیا۔ شاید لیکن اب دیکھا کتنے خطوط آتے ہیں' آپ کے پرچے میں تو بہت سارے مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔"

"ایسے خطوط تو تعریفی خطوط کے مقابلے میں کم ہیں۔"

"لیکن عوام کی ذہنیت اور ذوق کا پرتو تو انہیں میں نظر آتا ہے۔"

"لیکن انگریزی میں اس طرح کی چیزیں کس قدر مقبول ہوتی ہیں پینگون نیو رائٹنگ میں تو خیر تین چار چیزیں غیر مطبوعہ بھی ہوتی ہیں لیکن آرگوسی اور ریڈرس ڈائجسٹ میں تو سبھی انتخاب ہی ہوتا ہے' پھر بھی ان کی کتنی قدر ہوتی ہے' ہمارا "نیا دور" کیوں؟" "تم بھول رہی ہو' نازی' یہ ہندوستان ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔ کتنی تلخی تھی اس ہنسی میں! لیکن سوچو تو صرف غیر مطبوعہ چیزوں سے اتنا اعلیٰ معیار رکھنا کیسے ممکن ہے، فرض کرو سبھی مشہور ادیبوں کی معاونت ہمیں حاصل بھی ہو گئی۔ پھر بھی ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہر دفعہ وہ فسٹ ریٹ ہی لکھیں گے؟ بہت کم ادیب ہمیشہ ایک ہی سطح کے افسانے لکھتے ہیں' بیدی کی طرح ـــــ آج کل کتنے ہی اچھے ادیب پہلے کے سے افسانے نہیں لکھ رہے ہیں'

"میں مانتا ہوں پرچہ کا یہ معیار قائم رکھنا دشوار ہے۔لیکن جن سے بہت اچھی کہانیاں انتخاب کی جا سکتی ہیں۔ایسی کتابیں اور رسائل تو بہت کم ہیں ہندوستان میں، اور اکثروں کی نظر سے یہ گذر چکے ہوتے ہیں۔ایسا پرچہ تو صرف ان لوگوں کے ذوق کا ہوگا،جنہیں اچھی کتابیں رکھنے کا شوق ہے لیکن اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جو رسالوں میں نئی نئی چیزیں پڑھنا چاہتے ہیں۔انہیں پڑھنے کے بعد وہ رسالے ان کے لئے پرانا ہو جاتا ہے......"

"تو ہم پرچے کم چھپوائیں گے۔"نیا دور" صرف بہت اچھے ذوق والوں کے ہاتھوں میں پہنچے"۔کم چھپوائیں تو خرچ کیسے نکل سکے گا..........

پرچوں کی تعداد خواہ کتنی بھی کم ہو کتابت، اور طباعت اور کور پیج کی پرنٹنگ کا وہی خرچ ہو گا۔طباعت اور کتابت کے لئے روپے فارم کے حساب سے دیئے جاتے ہیں۔اور کور پیج کے لئے کتنے رنگ کی پرنٹنگ ہے اس حساب سے"ہم نے پرچہ مالی فائدہ کی غرض سے تو نکالا نہیں لیکن خرچ بھی نہ نکلے تو؟ تم جانتی ہو کتنا خرچ آتا ہے ہمیں"نیا دور" پر چھتیس روپے ریم سے کم کا کاغذ ہمیں کبھی ملا ہی نہیں۔اور آئندہ نمبر کے لئے تو پچاس روپے ریم والا چکنا،تئیس پونڈ کا کاغذ خرید کر پریس میں رکھ آیا ہوں۔"

"افوہ!کیوں خریدا اتنا مہنگا کاغذ؟ پچاس روپیہ ریم!"

"سفید کاغذ بالکل نا پید ہے ان دنوں!جو ملتا ہے وہی خریدنا پڑتا ہے"

یہاں اتنی قیمت پر بھی کافی نہیں ملتا۔"

"لیکن ہم اخباری کاغذ کیوں نہ استعمال کریں؟ تم کہہ رہے تھے اس کی قیمت صرف بارہ روپیہ ہے۔"

"اخباری کاغذ استعمال کرنے کی ہمیں اجازت نہیں۔ صرف ان پرچوں کے لیے جو ۱۹۴۲ء سے پہلے نکلتے تھے اخباری کاغذ کا کوٹا منظور ہوا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں؟ "نیا دور" کی نوعیت کو بدلنا ہوگا؟"

"ہاں" انہوں نے دبی آواز میں جواب دیا۔ اور فہرست کی کاپیاں بنانے لگے۔

نسرین اٹھ کر کونے والی الماری میں سے خطوط کی فائلیں نکال لائی اور جن خطوط کا جواب دے دیا تھا، انہیں ہیچ کر کے الگ الگ فائلوں میں لگانے لگی۔ چند خطوط خریداروں کے تھے۔ یہ فائل خطوط سے بھر کر پھوٹ رہی تھی۔ اس میں تعریفی خطوط بھی تھے۔ اور ایسے بھی جن میں مطبوعہ مضامین شامل کرنے کی شکایت ہوتی تھی۔ نسرین کو اس وقت بے حد غصہ آرہا تھا۔ اسی کا جی چاہا اس طرح کے خطوط چن چن کر پھاڑ دے۔ اکثر خطوط میں ملکے سے یہ لکھا ہوتا "لیکن بہتر ہوگا آپ مطبوعہ مضامین نہ شامل کریں۔ ویسے گٹ اپ تو بہت خوبصورت ہے"
..... "آپ کے رسالے میں اِدھر سے اُدھر سے لی ہوئی چیزیں ہی ہوتی ہیں آئندہ سے نئی چیزیں دینے کی کوشش کیجیے۔" کبھی کوئی وی۔ پی میں ڈاک خرچ

کے تین چار آنے معاف نہ کرنے پر بڑی خفگی سے لکھ دینا۔" آپ تو محض شہرت حاصل کرنے کے لئے ایڈیٹر بن بیٹھے ہیں۔ اِدھر سے ایک مضمون لے کر ڈال دیا، ادھر سے ایک لے کر ڈال دیا۔ چند ترجمے شائع کر دیئے۔ کیا یہی ایڈیٹنگ ہے؟ ایسا رسالہ کون پڑھے گا؟ گویا ایک رسالہ نکال لینے سے شہرت حاصل ہو جاتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر بیکار رسالہ کا ایڈیٹر مشہور آدمی بن جاتا! اور ترجمہ کی یہاں بالکل قدر نہیں! وہ اور شاہد تھے کہ مختلف ملکوں کے افسانوں کے مجموعے پڑھ کر انتخاب کرتے، اس خیال سے کہ اردو ادب دوسری ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں سے استفادہ حاصل کر سکے۔ اردو دان مختلف ملکوں اور زبانوں کے ادب کی رفتار، رجحانات اور نئی تکنیکوں سے آگاہ ہوں۔ ان کے پاس کسی ملک کے افسانوں کے مجموعے نہ ہوتے تو شاہد محض ترجمے کی غرض سے انہیں خرید لاتا۔ اور وہ اپنا وہ وقت جس میں وہ فسانے یا مضامین لکھ سکتی تھی۔ ترجموں میں صرف کر رہی تھی۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد ان تراجم کی یہ قدر ہو رہی! واقعی ہندوستان میں ہنگون نیو رائٹنگ کی طرز کا پرچہ نکالنا حماقت ہی تو ہے۔ ایک اور خط میں لکھا تھا، کئی چیزیں تو میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ کیا آپ مہمانوں کی جھوٹے کھانے سے تواضع کرتے ہیں؟ جھوٹا کھانا! ایسی نعمت جو مغرب میں خزینہ کی طرح حفاظت سے رکھی جاتی یہاں جھوٹا کھانا سمجھ کر پھینکی جا رہی تھی۔ یہ صاحب خریدار نہ تھے۔ شاید کسی بک سٹال سے لے کر پڑھا تھا۔ پھر ایک

نظم، افسانے کی خامیاں جی کھول کر بیان کی گئی تھیں! جوش اور
احتشام حسین تک لپیٹ میں آ گئے تھے۔ "یہاں تک کہ "ٹرمینس" جیسا بلند پایہ
افسانہ بھی ان کی نگاہوں میں نچ نہ سکا تھا۔ اور اکثر خطوط میں پرچہ کے وقت پر
نہ نکلنے کی شکایت تھی۔ ان کی دشواریوں میں یہ خط الگ انہیں پریشان کر رہے
تھے لیکن چند ذوق والے بھی تھے۔ "نیا دور" کے پچھلے سب پرچے بھیجنے کی
ان کے خطوں میں درخواست ہوتی تھی۔ اس نے خطوط رکھ کے یہ فائل بند
کر دی۔ پبلشر کا خط اس نے اپنے خطوں کی فائل میں رکھ دیا۔ "ناز نسرین کا
مجموعہ شائع کرنے کا خیال ہے۔ ازراہِ مہربانی ان کا پتہ لکھ بھیجئے گا۔" اس فائل
میں دو تین اور ناشروں کے خط بھی تھے، اور ان میں سے ہر ایک لکھتا تھا۔ نفع
کمانا ہمارا مقصد نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ابھرنے والوں کی مدد کر سکیں۔
شاید آئندہ رائلٹی کم دینے کے لئے پہلے ہی سے یہ حربہ استعمال کیا جا رہا تھا!
مضمون نگاروں کے خطوط کی فائل میں اس نے دو خط رکھے۔ اور ان کے
ساتھ ملفوف نظمیں پڑھ کر ایک ناقابلِ اشاعت مضامین میں رکھ دی۔ دوسری
زیرِ غور مضامین کی فائل میں۔ اور ان مضمون اور نظمیں بھیجنے والوں کے خطوط
میں تو "نیا دور" کی اس قدر لمبی چوڑی تعریف ہوتی تھی۔ "اچھے رسالوں
کی کمی کے دنوں میں آپ نے اس قدر جلد ہندوستان کے بہترین اردو رسالوں
کی صف میں جگہ لے لی ہے۔ "ادبی دنیا" "ادبِ لطیف" اور "ساقی" کے

پایہ کا رسالہ ہے۔ اور اس کے ظاہری حسن کا کیا کہنا، آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں....
وغیرہ، وغیرہ، "پھر آمدم بر سر مطلب" ایک نظم (یا مضمون یا افسانہ) بھیج رہا ہوں۔
"مینا دور" میں شائع کر دیجئے۔ پھر احمد علی کا خط رکھنے کے لئے اس نے مشہور اہلِ قلم
کے خطوط کی فائل نکالی۔ یہ فائل دیکھ کر اسے کچھ سکون سا ہوا۔ کتنے اچھے خطوط ہیں
اس میں! پہلے پہلے جب ان ادیبوں کے خطوط آنے شروع ہوئے تھے تو کتنی
بے پناہ خوشی ہوتی تھی انہیں! انہیں ڈاک کا کس بیتابی سے انتظار رہتا۔
پوسٹ مین کو دور سے آتا دیکھ کر شاہد گیٹ میں جا کھڑا ہوتا، اور وہیں سے آواز
دیتا۔ "ہمارا کچھ ہے پوسٹ مین؟" ڈاکیہ اثبات میں سر ہلا دیتا۔ پھر نزدیک آکر
کہتا۔ "آپ کی تو ہر روز اتنی ڈاک آتی ہے" وہ ان کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتا۔
اوپر ہی سے لفافوں کی تحریر دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتے۔ "یہ احتشام حسین
کا ہے، یہ غلام عباس کا، یہ اختر اورینوی کا، یہ قاضی عبد الغفار کا، یہ فراق کا....
کبھی وہ دور ہی سے اسے لفافہ دکھا کر کہتا۔ "اگر تم پہچان لو یہ کس کا ہے تو
تمہیں پہلے پڑھنے کو دوں گا۔" اور وہ غور سے دیکھتی "بادا موزیل لکھا ہے...
اختر رائے پوری کا ہے۔ کھلے کھلے حرفوں میں لکھا ہے' انور کا ہے۔ اور یہ تو
پوسٹ مین نے بیرنگ بتایا تھا۔ سلام مچھلی شہری کا ہے' اور وہ معلوم نہیں کرشن چندر
کا ہے یا راما نند ساگر کا، دونوں کی تحریر اس قدر ملتی جلتی ہے' کرشن چندر کا ہوگا"
— "نہیں ساگر کا دیکھیں؟" اور وہ لفافہ پھاڑ کر بڑے فتح مندانہ انداز میں کہتا

ساگر کا ہے؟" کبھی وہ ڈاکئے کو دور سے دیکھ لیتی، تو شاہد کو پتہ لگنے سے پہلے
چپکے سے کھسک کر ڈاک لے لیتی۔ پھر اُسے آواز دے کر دور ہی سے ہاتھ اٹھا
کر خطوط دکھاتی۔" ارے، ڈاک آئی ہے کیا۔ لاؤ ادھر" —— نہیں وہ اور دور
بھاگ جاتی لیکن جلد ہی پکڑلی جاتی اور ایک ہی جھپٹے میں خطوط چھن جاتے۔ اور
وہ بڑے اشتیاق سے شاہد کی سبز پتلیوں کو گھومتے دیکھتی۔ کبھی کبھی ان میں ایسی
چمک آجاتی۔" کیوں کیا لکھا ہے؟ وہ بے تابی سے پوچھتی" احمد علی نے اسے
بک سٹالوں پر ڈھونڈا ہے۔ بیدی نے خرید کر پڑھا ہے۔ پرچہ کی کامیابی کا اس
سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ یہ تو پہلا ہی پرچہ ہے، سوچو تو! سبھی نے رسالہ
کے معیار اور گیٹ اپ کی بہت تعریف کی ہے اور تمہارے مضمون ..... "وہ
کچھ کہتے کہتے رُک گیا، وہ سبز کانچ کی گولیاں امرت رس میں ڈوب کر جگمگا گئیں
اور ان پر ریشمی جھالر جھلملا اٹھی! وہ ٹکٹکی باندھے اسے کچھ ایسی نظروں سے
دیکھ رہا تھا کہ اپنے چہرے پر ان محبت پاش نظروں کو محسوس کرتی۔ وہ خطوں کو
بھی کچھ دیر کے لئے بھول گئی۔ شاہد نے اس کا ہاتھ لیکر اس میں خطوط تھما دیئے
پھر سب ادیبوں کے خطوط انہیں باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ کتنے اچھے ہوتے
تھے یہ خطوط۔ ان میں ان کی شخصیت کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی، کرشن چندر
کی انسانیت پرستی، شاہد احمد صاحب کی بزرگانہ شفقت، اختر انصاری اور
اشک کی دوستی، امرت رائے کی اور وامق کی دوست نوازی، تمنائی کی

منکسر مزاجی، احمد ندیم قاسمی کے خطوط میں برادرانہ محبت اور خواہر نوازی، عزیز احمد اپنے خطوں میں بھی بے لاگ اور پر اعتماد نقاد لگتے تھے .... عسکری کے خطوط گمبھیر اور وزنی ہوتے تھے۔ بیدی کے خطوط میں اسی طرح کا پُر معنی اختصار ہوتا جیسے ان کے افسانوں میں اور انور کے خطوں میں جدت، بغاوت، آگ جیسے ان کے افسانوں میں ہوتی ہے، دھرم پرکاش آنند ان معدودے چند خوش قسمت ادیبوں میں سے ایک جو بڑے عہدے پر فائز ہیں، آفس میں اپنے ماتحتوں کی Sirring سے اکتا کر دوستوں میں بے تکلفی سے اظہارِ خیالات کے متمنی۔ کنہیالال کپور کے خطوں میں بھی ہلکے مزاحیہ ٹچ ہوتے چنانچہ ایک خط میں لکھا تھا...... مضمون بہت پسند آیا اور تصویر دل میں ___ کا فوٹو!

صرف ایک دو ادیبوں کے خطوط ذرا مربیانہ رنگ کے ہوتے۔ بڑے ادیبوں میں اپنی شہرت کے غرور کا شائبہ بھی نہ تھا۔ لیکن ذرا چھوٹے ادیبوں کو اپنے 'کچھ ہونے کا' بہت احساس ہوتا ہے۔ وہ افسانہ یا مضمون بھیجنے کا اس طرح وعدہ کرتے جیسے رسالہ پر احسان کر رہے ہوں۔ اور بعض تو لکھتے۔ "نیا مضمون یا افسانہ تیار نہیں ہے، فلاں فلاں رسالے میں میرے مضامین یا افسانے چھپے ہیں۔ ان میں سے آپ لے سکتے ہیں۔" لیکن بڑے ادیبوں نے کبھی یہ نہیں لکھا تھا کہ میرا کوئی مطبوعہ مضمون یا افسانہ لے لو، بلکہ افسانہ نہ بھیجنے پر بڑے

اور خلوص سے لکھتے "میں بہت شرمندہ ہوں بھائی۔ افسانہ نہ بھیج سکا۔ کچھ ایسی پریشانیاں رہیں کہ مکمل نہ ہوا۔ مکمل کر لوں تو آپ ہی کو بھیجوں گا۔ آپ ہی کے لئے لکھ رہا ہوں"...... اور یکایک مجھے ایک خیال آیا۔

ارے فہرست کی کاپی بنا ڈالی کیا۔ ذرا ٹھہرو۔ کیا ہم کچھ دیر اور انتظار نہیں کر سکتے۔ سہیل عظیم آبادی نے لکھا تھا وہ افسانہ مکمل کر کے جلد ہی بھیج دیں گے۔"

"نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔ ہاں کتابت کے دوران میں ان کا افسانہ آجائے تو یہ افسانے نکال کر ان کا شامل کر لوں گا۔"

"اور احتشام حسین نے بھی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"لیکن نازی ہم یہ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ وہ لکھیں گے اور جلدی بھیجیں گے بات یہ ہے کہ جو نئے لکھنے والے ہوتے ہیں وہ جلد جلد لکھتے ہیں تاکہ جلد ابھر آئیں۔ جنہیں شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ انہیں جلدی نہیں ہوتی۔ آج کل کتنے مشہور ادیب بالکل نہیں لکھ رہے ہیں...... میں نے فہرست کی کاپی بنا ڈالی ہے۔ پھر ایک دفعہ دیکھ لو" ان کی کرسی کے پیچھے جا کر میں نے فہرست دیکھی وہ اس انداز میں لکھی گئی تھی جیسے رسالے کے پہلے صفحہ میں ہوتی ہے اور فہرست کے نیچے ہمیشہ کی طرح ایک مخصوص نشان ڈال کر Specially written FOR the Penguin new writing کا سا جملہ لکھنے کی بجائے موٹے موٹے حروف میں لکھا گیا تھا سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص "نیا دور" کے لئے بھیجے

گئے ہیں، یہ بتانے کے لئے کہ کہیں پچھلے نمبروں کی طرح یہ بھی مطبوعہ نہ سمجھے جائیں
گویا مطبوعہ چیزوں کا انتخاب شائع کرنا شرم کی بات تھی! ہم معمولی پرچوں میں
"خاص برائے......" دیکھ کر کتنا ہنسا کرتے تھے! اور اب "نیا دور" کی فہرست
کے فٹ نوٹ پر بھی مضحکہ خیز جملہ لکھ کر کس قدر کوفت ہو رہی تھی ہمیں!

"لڑکے کو آواز دو، 'نازی' ابھی کاتب کے پاس فہرست اور مسوّدے بھجوا
دوں۔" میں لڑکے کو بلا لائی۔ وہ غور سے فہرست دیکھ رہے تھے۔ ان کی خوبصورت
پیشانی پر بل پڑے تھے اور چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی، میں جانتی تھی۔ کیوں
اداس تھے۔ میرے شاہد! وہ اتنا اچھا ذوق رکھ کر بھی اپنے ذوق کے مطابق
پرچہ مرتب نہ کر سکے تھے!

انہوں نے لڑکے کے ہاتھ میں مسودوں کا لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ "اس دفعہ
پرچہ واقعی کمزور ہوگا، اچھے ادیبوں کے مضامین اور افسانے بھی اتنے اچھے
نہیں ہیں اس میں! لیکن گھبراؤ نہیں 'نازی' یہ ایک ہی پرچہ ایسا ہوگا۔ آگے چل
کر سب اچھے ادیب ہمیں مضامین، اچھے مضامین بھیجتے رہیں گے۔"

لیکن کتنے ہی ذوق والے "نیا دور" کا فائل رکھ رہے ہیں، ایک پرچہ
بھی کمزور رہنا ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔"

وہ لڑکے کو گیٹ سے باہر نکل کر مڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لڑکا سائیکل
پر سوار ہو کر آن کی آن میں دور نکل گیا۔

انہوں نے دروازے کی طرف سے نظریں پھیر کر مجھے دیکھا اور دبی آواز میں
اداسی سے جواب دیا۔" ٹھیک کہتی ہو"
اب وہ سبز تیلیاں کتنی اداس اور پھیکی تھیں

رانی

وہ ابھی ابھی مل سے لوٹی تھی۔ تکان سے چوُر۔ اس کے انگ انگ میں درد ہو رہا تھا۔ بھوک کی شدت سے اس کے پیٹ میں گویا آگ سی لگ رہی تھی۔ مل کے احاطے میں مونگ پھلیوں کے ڈھیر دیکھ کر مارے بھوک کے کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ مٹھی بھر مونگ پھلیاں ہی اٹھا کے کھالے۔ کتنے ڈھیر پڑے تھے۔ بن چھلی مٹیالی پھلیوں کے ڈھیر ایک طرف، چھلے ہوئے گلابی دانوں کے ڈھیر ایک طرف دھوپ میں چمکتی ہوئی سوندھی سوندھی مونگ پھلیاں! وہ ہر روز ان ڈھیروں کو دیکھا کرتی تھی۔ لیکن کبھی اس کے منہ میں پانی بھر نہیں آیا تھا۔ گو اس کے ساتھ والی دوسری عورتیں للچائی ہوئی نظروں سے ڈھیروں کو دیکھا کرتی تھیں۔ لیکن آج وہ بھوک سے بیتاب تھی۔ مٹھی بھر پھلیاں اُٹھالے تو مل والوں کا کیا جائے گا؟ ایک

دوبارہ وہ لینے کے لئے جھکی۔ لیکن لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اُسے ہمت نہ
ہوئی۔ اگر مل والوں کو معلوم ہو جائے تو وہ ضرور اُسے نکال دیں گے۔ پھر وہ
دوسری نوکری کہاں ڈھونڈتی پھرے کئی دنوں سے رامو بھی کام پر نہیں گیا تھا
جب تک وہ بالکل اچھا نہ ہو جائے وہ اسے کام پر ہرگز نہ جانے دے گی۔ ایسے
وقت میں اس کا کام بھی ہاتھ سے نکل جائے تو یہ مالک لوگ ذرا ذرا سی بات پر
نکال دیتے ہیں۔ وہ رات بھی دو نوالے ہی کھا کر سو رہی تھی۔ اور صبح صرف ایک
کٹورا چھاچھ پی کر مل چلی گئی تھی۔ گاڑھی چھاچھ جو صبح صبح رامی نے اس کے لئے
بھیج دی تھی۔ کیسی اچھی ہمسائی تھی رامی! جب سے رامو بیمار پڑا تھا وہ کچھ نہ کچھ
بھیج دیا کرتی تھی۔ اس خیال سے کہ بے چاری گوری کہاں تک کرے گی۔ اسے
مل بھی کام کرنا تھا۔ اور رامو کی تیمارداری بھی۔ وہ اکثر کچھ پکا ہوا ہی بھیجتی تھی۔
کبھی راگی کی روٹی اور چٹنی۔ اُبلے ہوئے چنے یا بلّر، گاڑھی گاڑھی چھاچھ، پرسوں
اُگادی کا دن اس نے گڑ کی کھیر بھی بھیجی تھی۔ اور آج صبح صرف چھاچھ ہی۔ وہ
رامو کے لئے بھی ہر روز دودھ بھیج دیا کرتی تھی۔ البتہ دودھ کے وہ پیسے لے لیا
کرتی۔ ایسے دنوں میں جب دودھ روپے کا دو سیر ہو گیا تھا۔ مفت کون دیتا۔
اب تو گھاس کے ایک گٹھے کی قیمت چوگنی ہو گئی تھی۔ آج کل "کونڈا" بھی نہیں
مل رہا ہے۔ پھر بے چاری رامی پر کیسی مصیبت آن پڑی تھی۔ چار گائیں اس کے
ہاں بندھی ہوتی تھیں۔ کیسی موٹی تازی گائیں، بیماری آ کر ان میں سے دو دیکھتے

کے دیکھتے دیکھتے مرگئیں۔ ایک گابھ تھی۔ رامی کا اب صرف ایک ہی گائے پر گذارا تھا۔ مفت کہاں سے دیتی پھرتی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ صبح صبح دودھ دوہتے ہی تازہ دودھ، بغیر پانی ملائے، گوری کے ہاں بھجوا دیتی۔ اور گوری سے پاؤ کا صرف ایک آنہ لیتی۔ اس نے رامو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ابھی تک رامی کے گھر سے بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ گوری میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ خود کچھ پکا کر کھائے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بوریا بچھا کر ایک طرف پڑ رہے۔ وہ ایک کونے میں میلا سا جگہ جگہ پھٹا ہوا بوریا بچھا کر لیٹ گئی۔ سر نیچے رکھتے ہی اس کی نیند سے بوجھل جلتی ہوئی پلکیں بند ہونے لگیں۔ آج کل اسے نیند بھی تو میسر نہیں تھی۔ اس نے ساری رات اپنے بیمار رامو کے سرہانے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ اس کی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ رامو کے آہستہ سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ رامو جاگ پڑے تو اُسے کیا کھلائے گی؟ پاؤ بھر دودھ لوٹے میں ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ لیکن رامو تو اب دودھ نہیں پیئے گا۔ صبح جب رامی کے بھیجتے ہی اُس نے دودھ گرم کر کے ایک کٹورا رامو کو دیا تھا۔ تو صرف ایک ہی گھونٹ پی کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ اور کیسے ترستے ہوئے کہا تھا۔ "اب دودھ مجھے اچھا نہیں لگتا گوری! منہ پھیکا پڑ گیا ہے۔ ذرا ہری مرچ، ادرک، کوتھمیر، پودینہ ڈال کے چاول کا نرم نرم گیلا پکا کے دے تو کھاؤں۔" گوری نے سب ہانڈیوں میں ٹٹول

کے دیکھا۔ چاول کا ایک دانہ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ہانڈی میں چھٹانک بھر راگی کا آٹا بچ رہا تھا۔ یہ "راسن"، "کنٹرول" بھی عجب آفت ہے۔ پرسوں جب یہ سن کر کہ ڈپو اسی کے محلہ میں کھل گئی ہے وہ خوشی خوشی ٹوکری لے کر چاول، راگی لینے چلی تھی۔ تو اُسے دروازے پر ہی کس بری طرح سے دھتکارا گیا تھا "کوپن پاس نہیں ہے۔ چلی ہے چاول لینے! جا، جا کر گھر بیٹھ رہ چاول نہیں ملیں گے ...... جب کوپن ملے تو لے آ" تو کیا جب تک کوپن نہ ملے وہ بھوکوں مریں گے؟ اس دن وہ سویرے ہی چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ مرد بھی، عورتیں بھی۔ اتنی بھیڑ جمع ہو گئی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے، گالیاں دیتے، گرتے پڑتے، پاؤں کچلتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈپو والوں کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا "جب تک کوپن نہیں لائیں گے، چاول نہیں ملیں گے۔" وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر سب کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ لیکن بھیڑ تھی کہ آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انسپکٹر بھی آگئے تھے۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عورتوں کی چیخیں، کوسنے، آپس میں گالیوں کی بوچھاڑ، پھر درمیانی وقفوں میں "سوامی، سوامی، دیا کرو سوامی!" "سرکار، گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں سرکار!" "کل سے کچھ نہیں کھایا ہے حضور!" "بچے بھوکے ہیں سرکار۔" ہر ایک یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز سب سے اونچی جائے۔ اور انسپکٹر کے کانوں تک پہنچے۔ عورتیں اپنی ٹوکریاں آگے بڑھائے

دیتی تھیں۔"صرف چار آنے کے چاول سوامی!" دو آنے کی راگی ہی دے دو
سرکار، پرماتما بھلا کرے۔" ڈانٹ، دھتکار اور گھڑکیاں سن کر بھی ان کی زبستی
ہوئی التجائیں اور سوامی، سوامی کی رٹ برابر جاری تھی۔ پھر وہ ایک دم خاموش
ہو گئے تھے۔ اور آپس میں گالیاں دینی بھی بند کر دی تھیں۔ آخر اس سے کیا
فائدہ؟ پھر نہ جانے کس امید پہ وہ چلچلاتی دھوپ میں کھڑے انتظار کرتے
رہے۔ یہاں تک کہ بارہ بج گئے اور ڈپو کے مالک نے دروازہ بند کر دینے
کا حکم دے دیا۔ آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔ خیر گوری کے گھر تو کچھ چاول اور
راگی بچ رہی تھی۔ اور اس کے گھر پہ تھے بھی کون؟ صرف رامو اور وہ' ان
غریب بیچاروں کا کیا ہو گا۔ جن کے کئی کئی بچے تھے۔ بیچاری ستی نے اس دن
بڑھ کر انسپکٹر کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ رو رو کر کہہ رہی تھی "سوامی میرے پانچ
بچے ہیں سوامی! تین دن سے ایک دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا ہے سوامی۔ دیوتا نے،
سوامی! تین دن سے بچے بھوک مر رہے ہیں سوامی!" نوکروں نے ڈانٹ کر
اسے پیچھے ہٹا دیا۔ "ارے ہٹ عورت! اتنی دیر سے کہہ جو رہے ہیں کہ کوپن لے آ
تو چاول ملیں گے۔ پھر بھی کیا بک رہی ہے؟" "کوپن کب ملے گا سوامی!" وہ
گڑگڑا رہی تھی پھر وہ خاموشی سے آنکھیں پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اور گھر آکر
پانچوں بچوں کو ساتھ لے آئی۔ اُف وہ بچے! آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ صرف
ایک پھٹی لنگوٹی باندھے ننگ دھڑنگ۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ اور پسلیوں

کی ہڈیاں اتنی ابھر آئی تھیں کہ انہیں اچھی طرح گنا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے تین دن سے نہیں تو دو ایک دن سے تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے۔ اور چھوٹے بچوں کو تو ماں کھینچے لئے آ رہی تھی۔ انہیں آدمیوں نے جو آگے بڑھنے کے لئے ایک دوسرے کو دھکے اور گالیاں دے رہے تھے۔ اسے بچوں کو لاتی دیکھ کر خاموشی سے جگہ دے دی۔ وہ بچوں کو لیکر سیدھے انسپکٹر کے پاس پہنچی چھوٹے بچے سہمے ہوئے گم صم کھڑے تھے۔ ان میں سے جو بڑے تھے وہ پیٹ پر ہاتھ مار مار کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجا کر رہے تھے۔ سدّی نے آگے بڑھ کر سب سے چھوٹے بچے کو انسپکٹر کے قدموں میں ڈال دیا۔ انسپکٹر نرم مزاج آدمی تھے۔ شاید انہیں سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔ وہ بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے رک رک کر کہا۔ "میں...... کیا...... کیا کر سکتا ہوں ماں۔ جب تک کوپن۔" "تم ہی مائی باپ ہو سوامی ان چھوٹے بچوں پر دیا کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا رہی تھی۔ انسپکٹر گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک چھوکرے نے آگے بڑھ کر سدّی کو پیچھے دھکیل دیا۔ اور بچے کو انسپکٹر کے پاؤں سے الگ کر کے زمین پر بے دردی سے پٹک دیا۔ سدّی چھاتی پیٹ کر رونے لگی۔ کتنا دردناک نظارہ تھا۔ گوری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پھر رامی اور گوری اسے دلاسا دے کر باہر لے آئے تھے۔ وہ راستہ بھر روتی آ رہی تھی "ہمارا جنم ہی ایسا ہے ماں!" وہ اپنے

آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی۔ "پھوٹے نصیب ماں۔ یہاں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ یہاں کا لکھا مٹتا نہیں۔" وہ پیشانی پر انگلی مار کر کہتی۔ "جب سے وہ پرلوک سدھارے دکھ ہی دکھ بھوگ رہی ہوں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہی چلی جاتی تو اچھا تھا۔ یہ ننھے ننھے بچے کس پر چھوڑ گئے! یہ بچہ دیکھو ماں۔" وہ منجھلے بچے کی ٹھوڑی پکڑ کر بولی۔ "تین دن سے تپ میں بھُن رہا ہے، اس پر پیٹ کو کچھ نہیں! بھگوان جانے ہمارے باپ دادا نے کیا کیا پُن کئے ہونگے کہ ان بچوں پر ایسی آفت آئی"—— پھر رامی نے اُسے سمجھا کر چپ کیا۔ اور گھر جا کر راگی کا آدھ سیر آٹا اس کے گھر بھیج دیا۔ گوری نے بھی پاؤ بھر چاول بھجوائے اور سب سے چھوٹے بچے کو اپنے گھر اٹھا لائی تھی۔ اُسے روٹی، چٹنی جو کچھ بھی بچا تھا کھلا کر اس نے چھینکے پر سے دو کنولے بھی نکال کر دیئے۔ جو اس نے رامو کے لئے گڑ تل ڈال کر بنا رکھے تھے تو بچہ کیسا خوش ہو کر اس کی گود میں آ بیٹھتا تھا۔ رامو نے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "گوری! تجھے بھی ایک ایسا منّا ہو جائے تو" وہ شرما گئی تھی۔ "ہاں گوری گھر میں رونکھ ہو گی۔ ہم اس کے لئے اور کمائیں گے۔ اگر کما نہ سکیں تو کیا۔ جب بھگوان دے گا تو وہی پالے گا۔ ہم آدھ پیٹ کھا کے اِسے کھلائیں گے —— کیوں؟"—— رامو کو بچوں کی اتنی خواہش تھی! شاید اب اسے بھی ایک منّا...... نہیں وہ رامو کو ابھی نہیں بتائے گی۔ کچھ دن گذرنے پر بتائے گی۔ کتنا خوش ہو گا رامو —— گوری کو شرم سی محسوس ہونے لگی۔ اس

نے شرماتے ہوئے رآمو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھی، ایک میلا سا کپڑا اور کوپن لے کر اٹھی۔ اسے ڈپو گئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ کوپن مل جانے پر وہ دوسرے دن بھی گئی تھی۔ لیکن وہاں پھر یہ کہہ کر سب کو لوٹا دیا گیا تھا کہ ڈپو نئی کھلی ہے۔ ابھی ناپنے اور تولنے کی چیزیں نہیں آئی ہیں۔ البتہ چاول، اور راگی کے "موٹے" آ گئے ہیں۔ کل ضرور سب کو اناج دے دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ پھر نہیں گئی تھی۔ گو رآمی اور محلے کی دوسری عورتیں برابر جایا کرتی تھیں۔ اب تک وہ جوں توں گذارا کر سکی تھی۔ لیکن آج رآمو نے کتنی چاہ سے "گیدہ" کی فرمائش کی تھی۔ وہ ضرور آج ڈپو جا کر چاول لائے گی۔ دہلیز کے باہر قدم رکھتے ہی ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ہے۔ اس نے جلدی سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ کچھ دیر دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر آرام لیا اور چل پڑی۔ باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ دھوپ کی حدّت سے اس کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ پاؤں بُری طرح جل رہے تھے۔ اسے کئی دفعہ چکر آئے۔ پھر بھی وہ سنبھل سنبھل کر چلتی گئی۔ ڈپو اس کے گھر سے دور نہیں تھی۔ یہی کوئی چالیس گز کا فاصلہ ہو گا۔ لیکن بھوک اور تکان سے نڈھال گوری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ طے کر رہی ہے۔ خدا خدا کر کے دوکان آ گئی۔ اس دن کی طرح آج باہر بھیڑ نہیں کھڑی تھی۔ برآمدے میں سب قطاریں باندھے بیٹھے ہوئے تھے

دروازے کی ایک طرف مرد۔ دوسری طرف عورتیں۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئی پھر اُسے زور کا چکر آیا۔ تیز دھوپ سے ایک دم اندھیرے میں آنے کے باعث اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے صرف سبز سبز دھبے ناچ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ کچھ دیر بعد اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا ہے "کیوں جی اچھا نہیں کیا گورّی؟" — اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ رامیؔ اسے تھامے کھڑی تھی۔ "نہیں رامکا، جی تو اچھا ہے۔ پر پھجر سے کچھ نہیں کھائی تھی" "تو کیا پھجر سے بھوکی ہے گورّی؟ کیا کروں، میرے گھر میں بھی اناج کھتم ہو گیا تھا۔ صبح سے ڈپو پھر رہی ہوں۔ صبح آئی تو چھوکرے نے یہ کہہ کر بھیج دیا، راگی کھتم ہو گئی ہے دوپہر میں آئے گی، پھر گھر آکر جو کچھ آٹا بچا تھا اُس کا ہٹ گھوٹ کر بچوں کو ایک ایک نوالہ کھلا آئی۔ آ کے دیکھا تو ڈپو بند ہو چکی تھی۔ کل شام لچھمی کو بھیج کے آمینہ کے گھر سے لوٹا بھر کٹ منگائی تھی۔ کون امینہ؟ جانتی ہے نا، وہی گاڑی والے صاب جان کی جورو۔ اماں کیسی چنتری (چالاک) ہے وہ تو! کھوٹے کے لئے ہر روج کُلتی ابالتی ہے پر کبھی کسی کو ایک کٹورا بھی مپھت (مفت) دے دے تو جو چاہے کسم لے لے۔ ہمارا گھر دو کھدم پر پڑا ہے۔ بچے گلی میں کھیلتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ہی کٹ "نتھار نتھار" کر مٹکیوں میں بھرتی ہے بچے ترستی ہوئی نجروں سے دیکھتے رہتے ہیں پر وہ کسی بچے کو بلا کر ایک کٹورا

کٹ بھی نہیں دیتی! جب ننھا پیٹ میں تھا۔ کیا کہوں کیسے جی پڑ گیا تھا۔ کلتی کے کٹ میں! ایک دفعہ اس کے گھر سے ایک آدھ دفعہ لوٹا کٹ منگوایا تو پیسے لیکر ہی چھوڑی۔ سو کل میں ٹھیمیّ سے بولی۔ ”کٹ لے کے ایک آنہ پھینک آ۔ کیسے چاہیئے اس کا مال!“ ایسی بھی کیا کنجوسی، کاہے کو اتنی حرِس (حرص) اس کا مرد اپنے تانگے پر چھوکریوں کو سکول لے جاتا ہے۔ مہینے میں اُسی کے تیس روپیہ مل جاتے ہیں۔ چھ چھوکریاں جاتی ہیں اس کے تانگہ میں۔ ہر ایک سے برابر چھ چھ روپے لے لیتا ہے۔ دس بجے صبح کو سکول لے جاکر چھوڑنا، پھر شام کو سکول چھٹنے پر بلا لے آنا۔ پھر اس کے درمیان میں دوسری سواریاں بھی مل جاتی ہیں۔ وہ تیس روپے چھوڑ کے یہ اوپری آمد الگ۔ اچھا کھاسا کما لیتا ہے۔ اتنا مل کر بھی کاہے کو اتنی حرِس؟ ایک مٹکی کٹ کو آدھے کو آدھا پانی ملا کر گھڑا بھر بنا لیتی ہے۔ گھڑا لئے محلہ محلہ بیچتی پھرتی ہے کٹ کیا ہے پتلا پانی۔ ایک آنہ لوٹا بیچتی ہے بڑے گھروں میں گاڑھے کٹ کو پوچھتے ہیں اس کے لئے ایک الگ مٹکی اپنی بیٹی کے سر پر اٹھوا دیتی ہے۔ اتنی لکڑیاں جلا کر گاڑھا کٹ کہاں سے نکالے گی؟ اہا کیسی پکّی ہے وہ۔ بس اسی پانی ملے کٹ میں تھوڑی سی کچی کلتی پیس کر ملا دیتی ہے۔ اور دو آنہ لوٹا دیتی ہے...... تو کل میں اس کے ہاں سے کٹ منگائی تھی۔ رات بھر ذرا ذرا کے اچھا گاڑھا کٹ، اس میں املی، نمک، پیاز، کوتھمیر، ہری مرچ چُور رکھی تھی۔

گھر بھی تھوڑا بھیجنے کو تھی کہ مل سے آ گئے، آتے ہی کہنے لگے۔ "بڑی بھوک لگی ہے، لچھمی (لکچھمی) کی ماں، کھانے کو کچھ دیجیے"۔ جلدی سے ہٹ کے دو ٹیپے گولے ایک رکابی میں اور کٹورے میں پورا کٹ سامنے رکھ دیا۔ بھوک جوروں کی لگی ہوئی تھی۔ کٹ کھانے مل جائے تو کھوب پیٹ بھر کے کھائے۔ میرے لئے بھی کچھ نہ بچا۔ میں سمجھی کہ رامو بھیا اب کچھ کچھ اچھے ہیں۔ تو نے کچھ نہ کچھ پکا لیا ہوگا اس لئے صبح میں کچھ چھاچھ ہی بھیجی۔ ایسی بھی کیا سرم گوری؟ بچے باہر گلی میں کھیلتے رہتے ہیں۔ ذرا دیوڑھی میں کھڑی ہو کر انہیں پکار لیتی۔ اور تجھے کیا ہونا تھا مانگ لیتی! یوں تو میں بھی دوپہر کو کچھ نہ کھائی۔ پر میری بات چھوڑ، بچے والی، ایک دو وکھت پھاکے (فاقے) کرنا ہی پڑتا ہے۔ بھوکی رہنے کی رفت (عادت) پڑ گئی ہے۔ مگر تو! رامو کبھی تجھے بھوکا رکھا تھا؟"

"رامکا! تیری طرف سے تو اتنا آرام ملا مجھے! کتنے دن سے گھر میں چولھا تک نہیں جلائی۔ تو جو کچھ بھیجتی مجھے سے کھا کر چپ رہتی۔ اب بھی روج روج تجھے تکلیپھ دوں؟"

"کلہے کی تکلیف گوری! تیری "ایک جان" کے لئے جرا جیا وہ پکا دوں تو کیا ہاتھ سوج جائیں گے؟ چل، وہاں بیٹھیں گے۔ تو کھڑے کھڑے تھک جائے گی میری جگہ وہ ہے"۔ رامی دوسری قطار کی طرف اشارہ کرتے بولی "کب سے بیٹھی انتجار کر رہی ہوں۔ برابر ایک بجے سے۔ رام، رام! ڈپو کب کھلے گی؟ ابھی تک ایک

چھوکرا بھی نہیں پھٹکا"۔۔۔ رآمی نے گوری کو ساتھ لے جاکر اپنے پاس بٹھالیا۔

"اری یہاں کہاں لاکر گھسڑ رہی ہے تیری آشنی کو؟ میں بیٹھی ہوں یہاں بارہ بجے سے۔ مجھ سے پہلے لے گی چاول یہ؟ کلثوم محلہ بھر میں زبان درازی کے لئے مشہور تھی۔

"بی بی گھُسّے کیوں ہوتی ہو؟ تمہیں دو ایک لمانزے (منٹ) دیر ہوگئی تو کیا بڑا نکسان ہوگیا۔ بیچاری پھجر سے بھوکی ہے۔ اس کا مرد گھر میں بیمار پڑا ہے۔ اگر چاول اسے جرا جلدی مل جائیں تو تمہارا کیا جائے گا؟" رآمی بولی۔

"میرا کیا جائے گا؟ ذرا زبان سنبھال کر بات کر، ورنہ اچھا نہ ہوگا نجس کافرنی کہیں کی! میرے منہ لگتی ہے؟"

پھر وہ گوری پر جھپٹ پڑی۔"کیوں ری؟ اگر چاول زلدی (جلدی لینے تھے تو زلدی آتی! بڑی آئی کہیں کی زلدی لینے والی۔ چل نکل، وہاں جاکر آخری قطار میں بیٹھ رہ۔ نباب جادی آئی ہے دو بجے!"۔۔۔

گوری جو ڈپو کے قاعدوں کو نہیں جانتی تھی کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس لئے سوالیہ نگاہوں سے رآمی کی طرف دیکھا۔"اوہ! تو نہیں جانتی گوری! یہاں کھائدہ یہ ہے جو پہلے آئے وہ دروازے سے نجدیک بیٹھتا ہے۔ اور چاول اسے پہلے مل جاتے ہیں جو بعد میں آئے وہ پیچھے بیٹھتے ہیں۔" رآمی نے تشریح کی۔

"اگر ایسا ہے تو میں وہیں جاکر بیٹھ رہونگی میری طرف سے کاہے کو کسی کو تکلیف

ہوں۔ گوری اٹھ کھڑی ہوئی ــ "چل، میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ اس بے صبری کو چاول جلدی مل جائیں۔ پکا کے خوب پیٹ کاٹے۔" رامی ساڑی کی میریاں جھٹک کر کلثوم پہ ایک غصہ اور نفرت کی نگاہ ڈالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی "کیا کہتی ہے" کلثوم نے غضب ناک نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن رامی اور گوری جا چکی تھیں۔ اُن دونوں نے جا کر آخری قطار میں پہلی جگہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے انہیں جگہ نہ دی۔ وہ عورتیں بھی جو گوری کے بعد آئی تھیں اپنی اپنی جگہ لے چکی تھیں۔ رامی کے ہزار کہنے پر بھی کہ وہ ان سے پہلے آئی تھیں انہوں نے جگہ نہ چھوڑی۔ چار و ناچار ان دونوں کو سب سے آخر میں بیٹھنا پڑا۔

"ڈپو کھلنے میں ابھی کتنا وکھت ہے؟" رامی نے اس کے بازو بیٹھی ہوئی دودھ والی چنّی سے دریافت کیا ــ "چار بجے کھلتی ہے" ــ "رام رام، چار بجے؟ اب کیا وکھت ہوگا؟" "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ جب میں اس سامنے والے بنگلے پر سے گذر رہی تھی تو دو دفعہ ٹن ٹن بجا۔ اب بھی کوئی اڑھائی گھنٹے ہوں گے۔"

"بھگوان یہ بھی کیا آفت ہے! ابھی ڈیڑھ گھنٹہ انتجار کرنا ہوگا؟ جب سے یہ راسن شروع ہوا ہے آفت ہی آگئی۔" رامی نے سر تھام کر کہا۔

لیکن بہن کچھ بھی کہو۔ میں تو کہونگی یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ نہیں

توسب امیر لوگ اناج جمع کر لیتے۔ تھوڑا بہت جو بچتا وہ بہت مہنگے داموں بکتا۔ ہم غریبوں پہ تو بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی۔" فاطمہ بڑے گھر میں کام پہ رہ کر بہت سی باتیں سیکھ گئی تھی۔ "ہماری چھوٹی بی صفیہ کالج میں جا کر انگریزی پڑھتی ہے۔ وہ کہتی ہے بنگال میں ایسا ہی ہوا۔ امیروں نے اپنے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگا لئے۔ دوکان داروں نے بھی اناج چھپا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اور صرف تھوڑا اناج بہت مہنگے داموں بیچا کرتے تھے۔ بی صفیہ کہتی تھی وہاں چاول چار روپیہ من کا ڈیڑھ سو روپیہ من ہو گیا تھا۔ ہزاروں، لاکھوں آدمی بھوک سے مر گئے۔"

"رام رام تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟" رامی نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا۔" "یہ پیسے والے غریبوں پر کیا کیا ظلم کرتے ہیں۔ کچلتے ہیں پاؤں تلے، لہو چوستے ہیں ہمارا!" فاطمہ نے بی صفیہ کی اشتراکی باتیں بھی حفظ کر لی تھیں۔ "یہ کنٹرول ہمارے واسطے اچھا ہی ہوا۔ گورنمنٹ، اناج کے دام مقرر کر دیتی ہے دوکان دار کسی صورت میں بھی سرکار کی مقرر کی ہوئی قیمت سے زیادہ نہیں لے سکتے اگر دوکان داروں پر چھوڑ دیا جائے تو ایک کے دس دام لیں۔" —— فاطمہ بھوئیں چڑھا چڑھا کر اپنی معلومات سے سب کو مرعوب کر رہی تھی — اور دیکھو اناج سب کو برابر برابر دیا جاتا ہے امیر لوگ پیسے زیادہ بھی دینا چاہیں تب بھی انہیں اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اس کنٹرول کے قاعدہ میں ایک طرح

سے امیر غریب سب برابر ہو گئے ہیں۔"

"کہاں برابر ہوئے؟ یہیں دیکھ لے کتنا فرکھ (فرق) کرتے ہیں۔ ہم تین چار گھنٹے سے بیٹھے انتجار کر رہے ہیں۔ کوئی ایک سوٹ بوٹ والا منہ میں سگریٹ دبائے، اپنے نوکر کو ساتھ لئے آپہنچتا ہے تو ہم پڑے سڑا کریں، فوراً اس کے لئے چاول ناپ دیئے جاتے ہیں۔ ہم ذرا سا منہ کھولیں تو دوکان والے اتنی گالیاں سناتے ہیں۔ پر پیسے والوں سے ایسے بات کرتے ہیں۔ جیسے منہ میں شکر رکھی ہے۔ اور بھلا کنٹرول کے کھانڈوں کا لحاج رکھتے ہیں یہ امیر لوگ؟ ان کے لئے تین حصوں میں دو حصے موٹے چاول اور ایک حصہ باریک چاول ہیں۔ بڑے بڑے ہافیسر جو ہیں اور پڑھے لکھا کے سارے کا سارا باریک چاول لے جاتے ہیں۔ روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے روپیہ، ہاں!" چنی چنگی اڑا کر بولی۔ "کیا میں یہ سب نہیں جانتی؟ تو ایک بڑے گھر میں کام کرتی ہے تو کیا۔ میں ایسے کتنے بڑے گھروں میں دودھ دیتی ہوں۔" تو کیا تو لیتی باریک چاول؟" اپنی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ جانے پر فاطمہ جھلّا اٹھی۔ اس نے بی صفیہ کی کتنی باتیں یاد رکھی تھیں، وہ ہر موقع پر انہیں دہرایا کرتی تھی۔ اب چنّی کے یکایک بیچ میں بول اٹھنے پر وہ سب اس کے دماغ سے نکل گئیں۔ اپنے حلقہ میں فاطمہ کی ہر بات گویا فتویٰ ہوتی تھی۔ بغیر کسی پوچھ گوچھ کے سب اسے مان لیتے۔ اب یہاں کون نکلی یہ اس کی بات پر اعتراض کرنے والی؟ فاطمہ چنّی پر جھپٹ پڑی۔ "اتنے روپے

جو ہیں نواب زادی کے پاس!"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی ہوں۔ اچھا باریک چاول کا جانے دیجیے بھلا یہ تو بتا جب راسن والے آئے تھے تو تیرے گھر پر جس سختی سے انہوں نے سب کچھ دیکھا۔ تیری بی صفیہ کے گھر پر بھی اتنی ہی سختی سے دیکھا؟"—— فاطمہ لاجواب ہو کر اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتی رہی۔"کیوں رآمی کیسے دیکھا انہوں نے ہمارے گھر وں پر؟"

یہ پوچھتی ہے چنّی؟ دیو رسے کتنا ستایا انہوں نے۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ ہانڈیاں کھول کر دیکھیں۔ ٹوکرے ہتیلیاں الٹ پلٹ کر دیکھے۔ بورئے تک بھی جھٹک کر دیکھے۔ سارا سامان تتّر بتّر کر دیا۔"

"اور میرے گھر میں۔"

چنّی نے اپنا قصّہ شروع کیا۔

"کچھ نہیں، رنگی کو پیاز املی لانے ذرا دوکان بھیجی تھی۔ خیر وہ مرد بیچارے ایک طرف کھڑے تھے وہ عورت جو تھی گھر کے اندر آ کر دیکھنے والی، وہ تو بلا تھی، بلا، شنی، پشاشی، ایسا میرے سر پڑ گئی۔"کہاں ہے اور ایک بچہ؟ تو نے جھوٹ موٹ کے چھ لکھوائے ہیں۔ یہاں صرف پانچ ہی تو ہیں۔" وہ ایسے ڈانٹ رہی تھی جیسے میں اُس کی کوئی نوکرانی ہوں۔ میں کتنا بولی۔" اماں، بچی ذرا دوکان گئی ہے"
"ہونہہ! دوکان گئی ہے! جھوٹی کہیں کی۔ تجھے معلوم نہیں تھا آج ہم آئیں گے۔

کیوں نہیں گھر پہ رکھا اسے ؟ جھوٹ لکھوا کے بہانہ بنا رہی ہے۔" ہم غریب بھی پہ جھوٹ نہ بولیں گے وہ بار بار مجھے جھوٹی کہہ رہی تھی تو گالیاں میرے منہ سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ پھر بھی صبر کر کے چپ ہو رہی۔ ہم غریب کیا کر سکتے ہیں۔ ہم بھی زور کریں تو الٹا ہمیں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں عاجزی سے بولی۔" نہیں ماں، "سچ مچ دوکان پہ پیاز لینے گئی ہے۔ ابھی آئے گی تم خود آنکھوں سے دیکھ لو" — "اس کے آنے تک کھڑی رہوں میں واہ !" — وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر غرور سے بولی۔ سیٹھ کا دوکان ہمارے گھر سے کتنا دور ہے، تو جانتی ہے نا، بس دو قدم، وہاں سے آنے کتنی دیر لگے گی۔ ان پانچ لہندوں (منٹوں) میں اس نے وہ دھوم مچائی۔ کیا مجھے اور دوسرے گھر نہیں دیکھنے ہیں ؟ تیرے ہی گھر پہ رات بھر پڑی ہوں ؟" خیر رنگی آئی، اور یہ بلا ٹلی ......"

"اور کنٹرول کرنے کو کر دیا" تیسری قطار میں بیٹھی ہوئی مریم بول اٹھی — لیکن اتنا خیال نہیں کہ کوپن جلدی بانٹ دیں۔ پیسے والوں کا کیا ان کے پاس تھوڑا بہت اناج تو ضرور بچ رہا ہو گا وہ مہینہ آدھ مہینہ بھر کا سودا ایک ہی وقت لے لیتے ہیں لیکن ہم غریب پائی پائی کا سودا لینے والے، ہمارے پاس کہاں سے بچ رہے ؟ انہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ کوپن جلدی نہ دیں۔ تو ہم بھوکوں مریں گے۔ یا اللہ ! دو تین دن غریبوں پہ کیا آفت ٹوٹ پڑی ! سنتے ہیں فلاں محلہ میں، جب راشن افسروں کی گلی میں آیا تو سب عورتیں جھاڑیں

لے کر گھروں سے نکل پڑیں اور اسے گھیر لیا۔ کہتے ہیں اُسے پکڑ کر مارا بھی لیکن نہ جانے یہ کہاں تک سچ ہے۔ اماں! کتنی ڈھیٹ ہونگی اس محلہ کی عورتیں۔ ہم تو بھیگی بلیاں بن کر دبک رہیں۔"

"ہمارے محلے والے کیا کم ہیں؟" چنی نے کہا۔ "دیکھا نہیں جب پہلے دوسرے دن انہیں چاول نہیں ملے۔ انہیں دھتکار کر لوٹا دیا گیا، تو رات ہی رات جاکر ڈپو کا قفل توڑ کے تین چار "موٹے" چرا لائے۔"

"ارے سچ کیا؟" گوری نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں کیسی گڑبڑ مچ گئی۔ پولیس والے آگئے۔ انسپٹر آدھی رات کو آپہنچے۔" فاطمہ بولی۔

اور ایک بات کہوں۔ جب راشن والے ہمارا گھر دیکھ گئے تو میں سامنے والے بنگلے میں دودھ کے پیسے مانگنے گئی۔ اس رات، سچ کہتی ہوں رامی! میرے پاس ایک چھٹی پائی بھی نہیں تھی۔ وہاں گئی تو عجب ہی تماشا دیکھا۔ راشن والے وہاں تھے لیکن گھر کے لوگ سب اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صرف دو ایک کھڑے راشن والوں سے بات کر رہے تھے۔ "تو آپ کے گھر پہ چودہ آدمی ہیں؟"۔ "ہاں" — بس اتنا ہی۔ نہ آدمی بلوا کر دیکھے گئے نہ اس عورت نے خود کمروں میں جا کر دیکھا۔ وہ گھر کی مالکن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی "آپ کو کل ہی کوپن مل جائے گا......" اور اس گھر میں میں جب سے دیکھ رہی

ہوں صرف سات ہی آدمی رہا کرتے ہیں۔ لیکن مزے سے چودہ آدمیوں کے چاول مل جائیں گے۔ بس پھر کیا۔ میری ایک بچی باہر گئی تھی تو اتنی دھوم مچائی اس نے، ایک اور بات کہوں۔ اس گھر میں پہلے سے کئی پتلے دھان تھے۔ جھوٹ نہیں بولتی، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک چھوٹی کوٹھری میں مُوٹے پر مُوٹے رکھے تھے۔ سچ کہتی ہوں، مُوٹے چھت پر جا لگے تھے۔ اس دن، بھولے سے ہوگا۔ کوٹھری کھُلی پڑی تھی۔ اس عورت نے جھانک کر دیکھا۔ وہ بھی یوں ہی، ورنہ ایسے ہی چلی جاتی۔ مالکن سے پوچھنے لگی۔ "کئی پلّے ہونگے؟ کوئی دو پلّے ہوں گے۔ لیکن یہ سب دھان کے مُوٹے ہیں۔ اس حساب سے صرف ایک پلّہ چاول ہوئے۔ اور چاول ہمارے پاس کوئی دس سیر ہوں گے" مالکن نے جواب دیا۔ پر میں جانتی ہوں اندر چاول کے تین مُوٹے تھے ریڑھ پلّے سے کم نہ ہوں گے۔" عورت نے پھر کوئی پوچھ گوچھ نہیں کی۔ باہر جا کے کہہ دیا "دو پلّے دھان ہیں۔" دوسرے دن میں دودھ دینے گئی تو باتوں باتوں میں مالکن سے پوچھا۔ "مائی، کوپن مل گیا تمہیں؟" "ہاں مل گیا۔" "لیکن تم تو ابھی ڈپو سے چاول نہیں منگواؤ گی۔" "کیوں، کیوں نہ منگاؤں؟" — "راشن والوں نے لکھ لیا ہے نا کہ دو پلّے دھان جمع ہیں۔ وہ دھان تمہارے حساب سے کاٹ لئے گئے ہوں گے۔" "نہیں کوپن میں تو کاٹے نہیں گئے ہیں کل سے ہمیں برابر چودہ آدمیوں کا اناج مل جائے گا۔" میں نے پوچھا "مائی! تمہیں ضرورت سے زیادہ

چاول ملتے ہیں نا۔ مجھے بھی اپنے کوپن میں سے کچھ دے دو۔ میرے دودھ کے حساب میں پیسے توڑ لو۔ کیا کریں مائی! ہم غریب محنت مزدوری کرنے والے دن میں پاؤ بھر چاول سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اور ہم چاول کہاں سے کھائیں مائی! تمہارے کوپن سے چاول کے بدلے بھی کچھ راگی ہی لے لونگی۔ غریبوں کا پیٹ بڑا ہوتا ہے مائی! ہمارے بچے بھی بہت کھاتے ہیں۔ کھانے کو نہیں ملتا پر کھاتے بہت ہیں...... دوگی مائی؟" ارے چنّی یہ نہ پوچھ! یہ کنٹرول کا معاملہ ہے۔ تجھے دیں گے تو ہم مفت میں پکڑے جائیں گے"—— کیوں امیر غریب برابر ہوئے نا؟ چنّی نے فاطمہ پہ طنز کی۔

"پرسوں تو بہن میرا پیٹ جل گیا دیکھ کر۔ ابھی سب کو اناج نہیں ملا تھا۔ کہ بارہ بج گئے۔ ڈپو بند کرنے کا وقت تھا۔ نوکر باہر آکر دروازہ بند کرنے لگے۔ سب ایسا ترس رہے تھے۔ اتنا گڑگڑا رہے تھے۔ 'سوامی! پانچ لمحے ٹھہرو سوامی!' مٹھی بھر اناج تو دے دو سرکار۔ اب گھر میں پکانے کے لئے کچھ نہیں ہے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔" ہم تین گھنٹے سے بیٹھے انتجار کر رہے ہیں سرکار! خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ سوامی!" نوکر انہیں اس طرح باہر ہانک رہے تھے جیسے جانوروں کا گلہ ہو۔" نہیں دیں گے چلو۔ دیر سے کاہے کو آئے؟"

"ہم نو بجے آئے سرکار دیر سے نہیں۔" "نہیں ملیگا چلو!" اور جب دو آدمی سائیکل پہ اپنے نوکروں کو ساتھ لئے آئے۔ تو پھر سے ڈپو کھول کر ان کے لئے

چاول ناپ دیئے گئے۔ ڈپو کھلی دیکھ کر پھر سب اندر ٹوٹ پڑے۔ آس کے مارے کہ جب پھر قفل کھلا ہوا ہے تو انہیں بھی مل جائے گا۔ لیکن نوکروں نے گالیاں دے کر پھر انہیں نکال باہر کیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ سب ایسا ترس رہے تھے میں تبھی تبھی چاول لیکر باہر نکلی تھی۔ کھڑی دیکھا کی۔ میرا تو پیٹ جل گیا دیکھ کر۔" مریم بولی۔ گوری خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ بھوک اور تکان سے اس پر نیم بیہوشی سی طاری ہو رہی تھی۔ اسے عورتوں کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

"چار بجنے والے ہیں۔ اب کھل ہی جائے گی"...... یہ سن کر گوری اپنی غنودگی سے چونک پڑی۔ ایک سوٹ میں ملبوس آدمی اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر اپنے نوکر سے کہہ رہا تھا۔ گوری نے آنکھیں مل کر دیکھا بیٹھی ہوئی عورتوں اور مردوں کی قطاروں کے بیچ میں دروازے کے پاس چند متوسط الحال عورتیں اور مرد اپنے نوکروں کو ساتھ لئے کھڑے تھے۔ نوکر بڑے بڑے ٹین اور اور تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔

"اس ماہ کے چاول ابھی نہیں لئے تم نے ؟"

"ابھی نہیں، دوکاندار نے مجھ سے کہا تھا کہ بہترین باریک چاول آج آئینگے اس لئے اب لینے آیا ہوں۔"

ارے یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو میں بھی آج ہی لیتا۔ میں نے پہلی کو ہی چاول لے لئے۔ اس وقت صرف موٹے چاول تھے یہاں۔"

"تو کیا مضائقہ ہے۔ آج بھی کچھ چاول لے لونا۔ بہت اچھے ہیں۔ کل دوکاندار نے نمونہ بتایا تھا۔"

"نہیں میں تو پورے مہینے کے لے چکا ہوں۔ آج شکر کے لئے آیا ہوں۔"

"اور ہاں بہن یہ ڈپو والے ناپنے تولنے میں کتنی کمی کرتے ہیں۔ پرسوں چھوکرے کو بھیج کر پنیر شکر منگوائی تھی۔ گھر پر ناپ کر دیکھا تو برابر سیر بھر کم آئی۔ ناپنے سے اندازہ لگ جاتا ہے؟ شکر تول کی ایک سیر ناپ کی ایک پاؤ ہوتی ہے۔ برابر ایک سیر ناپ کی ایک پاؤ ہوتی ہے۔ برابر ایک پاؤ کم آئی۔ اس لئے آج میں ہی نکل آئی۔ دیکھوں گی کہ دوکان والا کم تولتا ہے۔ یا وہ چھوکرا ہی سیر بھر شکر مار بیٹھا تھا۔" ایک عورت کہہ رہی تھی۔ "نہیں اس میں تمہارے چھوٹے کا کوئی قصور نہیں یہ ڈپو والے ہی ناپنے کے پاؤ سیر، اور تولنے کے "بٹ" چھوٹے رکھتے ہیں، میرے ہاں بھی شکر کم آئی۔

"ارے پھر بھی یہاں غنیمت ہے۔ بنگلور میں سنتے ہیں، ڈپو والے شکر میں سوجی ملا کر بیچتے ہیں۔" ایک دوسری عورت بھی ان دونوں کی گفتگو میں شامل ہوئی۔

"یہ سب باتیں گورنمنٹ کو معلوم کرانا چاہیئے۔ پھر پریس کس کام کے لئے ہے؟"

"بنگلور کے اخبار اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ میں نے یہ سوجی والی بات

اخبار ہی میں پڑھی تھی۔"

"جنگ کے پہلے ہم ہمیشہ روپے کے چھ سیر والے چاول کھاتے تھے، یہ موٹے چاول، میرے اللہ، بالکل کھائے نہیں جاتے۔" "چھڑ بین کے پکائیں تو کچھ غنیمت ہے۔ ایسے ہی بغیر پالیش کے کھائیں تو منہ میں لینے نہیں ہوتا۔ جیسے گھاس چبا رہے ہوں۔ پرسوں ہماری ماما چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔ چھڑے ہوئے چاول ختم ہو گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو کسی کو "مسل" پکڑنا بھی نہیں آتا۔ مجبوراً ایسے ہی چاول پکائے اس دن۔ میں تو دن بھر بھوکی رہی۔"

ہاں اب تو مل ہی بھی پالش نہیں کرا سکتے۔ کیا مصیبت ہے۔ گھر پہ ہی چھڑ لیں تو دو ایک نوالے کھا سکتے ہیں"...... بھئی یہ لکڑی پہ بھی کیا کنٹرول ہوا ہے ہفتہ بھر کے لئے ایک روپے کی!" ایک اور صاحب کہہ رہے تھے۔ نہانا بھی میسّر نہیں۔ مجھے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی عادت نہیں۔ چار دن ہوئے نہا کے۔ ایسی بے چینی ہے۔"

"بھلے آدمی! تم نے بھی کنٹرول کا خوب اثر لیا۔ زیادہ کیوں نہیں منگوا لیتے۔ ہمارا نوکر دو تین جگہ سے ایک ایک روپے کی لکڑی جمع کر لیتا ہے۔ اچھی سرو کی لکڑیا روپیہ کی سوا تین من ملتی ہے۔ خراب لکڑی سوا چار من۔ پھر کیا مزے سے دس بارہ من جمع ہو گئے۔ دو تین جگہ ہی کیا وہ ایک ہی جگہ پہ ہفتہ میں دو تین جاتا ہے پھر بھی اسے لکڑی مل ہی جاتی ہے۔ کبھی کبھی دو ایک روپیہ کی لے آتا ہے۔ بھئی

کنٹرول پر اتنی سختی سے عمل کرو تو بس خوب کام چلا! کل تمہارے نوکر کو ہمارے چھوکرے کے ساتھ بھیج دو۔ جتنی چاہئیں لکڑیاں دلوا دوں گا۔

"شکریہ۔ بہت شکریہ......"

لوگوں کے ہجوم میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ ڈپو کے مالک معہ اپنے عملے کے آپہنچے تھے۔ قفل کھولتے ہوئے انہوں نے بیچ میں کھڑے ہوئے لوگوں سے ہنس کر کہا۔ "آج بہت ہی اچھے باریک چاول آئے ہیں لے لیجئے۔ ورنہ پھر پندرہ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر ان لوگوں کے نوکروں کو اندر بلوا کر چاول تلوانے لگے۔ وہ لوگ جو تین چار گھنٹے سے بیٹھے انتظار کر رہے تھے منہ دیکھتے رہ گئے۔ کلثوم کی گز بھر لمبی زبان بھی بند تھی۔ ان لوگوں کے لئے پتلے پتلے چاول اور ٹین ٹین بھر شکر ناپتے ناپتے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ قطاروں میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ سب پہلو بدل کر پھر سے سنبھل سنبھل کر بیٹھ رہے تھے آخر قطاروں کی باری آئی۔ ایک ایک مرد اور عورت دروازے کے دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے آگے بڑھتے تھے۔ اور اپنی تھیلیوں، ٹوکروں، ٹینوں اور کپڑوں میں دو سیر، تین سیر، چار سیر چاول، اور راگی لے لے کر دوسرے دروازے سے تیزی سے نکل کر جلدی جلدی قدم بڑھاتے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ کچھ تو اپنے میلے تیلے تولئے اور لنگیاں ہی لیتے آئے تھے۔ اس

کی "پوٹلیاں" باندھ کر کندھے پر لٹکائے، بغل میں دابے یا ہاتھ میں پکڑے بھاگے جا رہے تھے۔ انتظار ہی میں ان کا کتنا وقت جا چکا تھا۔ گھر میں بچے بھوک سے تڑپ رہے ہونگے۔ اب وہ بھاگ کر ہی چند منٹ تو بچا لینا چاہتے تھے۔

گوری پر اونگھ سی طاری تھی۔ جب آخری قطار کی باری آئی تو رامی نے اسے آواز دی، "گوری!" وہ چونک پڑی۔ دیکھا اب پانچ چھ آدمی ہی باقی تھے۔ ایک ہی جگہ اتنی دیر تک بیٹھے رہنے سے اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ اور پیٹھ اکڑ کر تختہ سی ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے اپنے پاؤں اوپر اٹھائے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں ہیں ہی نہیں دو ایک مرتبہ جھٹکا دیا۔ تو جیسے تلوؤں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ پاؤں تھام کر پہلو بدلی ہی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی میں ایک ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل ہی گئی تھی لیکن وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر چپ ہو رہی۔

اب وہ پانچ چھ آدمی بھی اناج لے چکے تھے ــــــ "اٹھ گوری تو ہی پہلے پہلے لے لے۔" رامی بولی۔ گوری بہ مشکل اٹھی۔ اس کے کولھوں میں بہت درد ہو رہا تھا۔ کمر میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ دروازے تک پہنچتے ہی اسے چکر آ گیا۔ اس نے بڑھ کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوکرے کے ہاتھ میں کوپن اور پیسے دے دیئے۔ ٹوکری نیچے رکھ کر اس نے وہ میلا سا کپڑا پھیلا دیا۔ اور کمزور

آواز میں بولی "ایک سیر چاول، چار سیر راگی"۔ "ذرا زور سے بول" لڑکے نے ڈانٹ بتائی۔

"ایک سیر چاول، چار سیر راگی، کیا کان نہیں ہیں تیرے؟" رامی نے گوری کی حمایت کی۔ ایک لڑکے نے جلدی جلدی ایک سیر چاول ناپ کے کپڑے میں ڈال دیئے۔ لال لال موٹے چاول۔ گوری نے کپڑا چاروں طرف سے سمیٹ کے اس میں گانٹھ باندھی۔ اور ٹوکری اٹھائی ہی تھی کہ ایک صاحب شیروانی پہنے اپنے نوکر کو لئے اندر داخل ہوئے۔

"دو ہفتہ کے باریک چاول ذرا جلدی بنوا دیجئے" وہ کوپن دیتے ہوئے بولے۔ "مہربانی سے جلدی کیجئے۔ ہم آج سینما جا رہے ہیں۔ بیگم کب سے تیار ہو بیٹھی ہیں۔ میں تانگہ لینے نکلا تھا کہ راستہ میں مسٹر یوسف مل گئے۔ انہوں نے کہا 'آج ڈپو میں بہت اچھے چاول آئے ہیں۔ بند ہونے سے پہلے جلدی جا کر لے لو ورنہ ختم ہو جائیں گے۔' میں اسے لے کر یہاں چلا آیا۔ ذرا جلدی کیجئے۔ ساڑھے چھ ہو رہے ہیں"۔

"ہاں ابھی بنوائے دیتا ہوں۔ ارے مادیا وہ باریک چاول والا موٹا کھول! —— آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج ہی آ گئے۔ ورنہ کل دوپہر تک سب ختم ہو جاتے"۔

"رحیم تو جلدی جا کے تانگہ لے آ۔ تانگہ گھر پہ چھوڑ کے پھر یہاں آنا"۔ پھر وہ دوکان کے مالک کی طرف مخاطب ہوئے "ذرا تکلیف کر کے اپنے ہی نوکروں سے..."

"ارے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ بستا تو اُن کے تھیلے کا منہ کھول کے پکڑ لے۔ مادیا ایک پچاس سیر چاول ناپ دے جلدی!"

"سرکار! پہلے اسے ایک چار سیر راگی ناپ دیجیے۔ اس کا سوامی گھر میں بیمار پڑا ہے۔" رامی نے التجا کی۔

"چپ رہ! جب دیں تب لے۔ ڈپو بند کرنے کا وقت کبھی کا ہو گیا تم لوگوں کو بھیج کر دروازہ بند کر دیتے تو ٹھیک تھا۔ ہم رحم کر کے ابھی تک سپلائی کر رہے ہیں اُلٹا ہمیں پر حکم چلاتی ہے۔ دیکھتی نہیں ان صاحب کو جلدی چاہیئے۔" سینما جانا اس کے رامو کی بیماری سے زیادہ اہم ہے! رامو اس کا رامو کتنی دیر سے جاگ کر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ صبح سے بھوکا، بھگوان! گوری کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"لے اب ٹوکری پکڑ" —— اس نے چونک کر ٹوکری آگے بڑھائی۔ چار سیر راگی ناپ کر ڈال دی گئی۔ رامی نے بھی جلدی سے اپنی چیزیں بنوا لیں اپنی ٹوکری کمر پہ رکھ کے اس نے گوری کے ہاتھ سے بھی راگی کی ٹوکری چھین لی۔ "لا ادھر میں اٹھائے لیتی ہوں۔" اور وہ گوری کی ٹوکری سر پہ رکھتی ہوئی بولی۔ "چل میں تجھے گھر تک پہنچا آؤں گی۔ گوری نے ایک ہاتھ میں چاول کی پوٹلی پکڑ رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے رامی کا بازو تھام کر چلنے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پاؤں من من بھر ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

گھر آگیا۔ رامی نے بھی اندر آ کر ٹوکری اتاری۔ گوری آتے ہی رامو کے پاس گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ انتظار کر کر کے پھر سو گیا ہوگا۔ وہ اس کے سوتے میں ہی چلی آئی تھی نا۔ نہ جانے اس نے گوری کو گھر پہ نہ دیکھ کر کیا خیال کیا ہوگا۔ سوچا ہوگا پھر مل چلی گئی ہے۔ پھر گوری نے دودھ کا لوٹا کھول کر دیکھا۔ دودھ کا لوٹا خالی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ رامو نے آخر دودھ تو پیا ہے۔

اس نے آدھ پاؤ چاول جلدی جلدی چھنے اور انہیں دھو کر چولھے پر رکھا۔ اُپلے اور اِدھر اُدھر سے لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور سوکھے پتے جمع کر چولھا جلانے لگی۔

"کیا پکا رہی ہے گوری؟" رامی نے پوچھا۔

"گیندہ، رامکا!" "اٹھ میں پکانے دیتی ہوں تو ذرا ستا لے۔"

"نہیں رامی! جب میں اپنے ہاتھ سے پکاتی ہوں تو وہ بہت چاہ سے کھاتے ہیں۔" گوری نے شرما کر آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہے تو تو ہی پکا لے۔" رامی زیرِ لب مسکرا کر گوری کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "بھگوان یہ پیرت (پریت) کی جوڑی سلامت رکھے۔ تیری پوت بنگڑی، ہمیشہ بندھی رہے۔ تم دونوں کو خوش دیکھ کر ہماری آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی ہے"........

"رامی! تیری بچی کو ذرا دکان بھیج کر ہری مرچ، کدھی میر، پودینہ منگا کر بھیج دے

وہ اپنے پلّو کی گانٹھ کھول کر ایک آنہ دیتے ہوئے بولی۔

"اچھا ابھی بھجوا دیتی ہوں۔" رامی چلی گئی۔

گیدہ پک گیا۔ گوری پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ دن بھر کی تکان اور چولھے کی گرمی! آج اُسے کتنی تکلیف پہنچی تھی۔ اُس نے عمر بھر ایسی تکلیف نہ اٹھائی ہوگی۔ گیدے کی ہانڈی اتارتے ہوئے اس نے رامو کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ رامو چپ چاپ آنکھیں کھولے اسے پکاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے مٹی کے کٹورے میں تھوڑا سا گیدہ نکالا اور رامو کے پاس لیجا کر رکھ دیا۔ رامو گیدے کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھ کر اٹھ بیٹھا۔ نوالہ منہ میں رکھتے ہی رامو کی باچھیں کھل گئیں "کیسا مجے دار پکا ہے گوری! سچ! اہا۔ تیج تیج۔ سوندھا سوندھا" وہ مزے لے لے کر کھانے لگا۔ گوری ایک کٹورے میں پانی لے آئی۔ "تو بھی بیٹھ جا گوری" رامو نے پیار سے کہا۔ گوری کہہ دیتی۔ "نہیں پہلے تم کھالو، تو کھاؤں" لیکن آج اُسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک مٹی کے برتن میں گیدہ لئے وہ بھی رامو کے پاس آ بیٹھی۔ گیدہ کھا کر رامو کے جسم میں طاقت عود کر آئی تھی۔ اس نے محبت بھری نگاہیں گوری کے چہرہ پر جما دیں۔ اور اس کی کلائی پکڑ کر بولا۔ "میرا کتنا کھیال رکھتی ہے..... کیسی اچھی ہے میری رانی!" رامو کی وہ نگاہ اس کی دن بھر سہی ہوئی تکلیف کا گویا صلہ تھی۔ گوری ایک لمحہ کے لئے اپنی ساری تکلیف بھول گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دن بھر فاقہ کی ہوئی تکان سے چور، غریب مزدورن نہیں ہے بلکہ سچ مچ کی رانی ہے رانی!——

شکست

باہر سرد ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ بوڑھا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ٹھٹھر رہا تھا۔ اُس کے من پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ گہری اُداسی! جھونپڑی کی نمی اس اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ سیلی چھت، گیلی گیلی دیواریں، مٹی کے فرش کی نمی اور تنہائی! کبھی ایسی ہی سرد شامیں کیسے مزے میں گذر جاتی تھیں۔ وہ دونوں آنگن میں بیٹھے آگ تاپا کرتے تھے۔ پھر وہ اندر آکر کمبل اوڑھے لیٹ جاتا۔ اس کی بیوی چولھے پر پانی چڑھا کر اس کے پائنتی آبیٹھتی۔ اور اس کے سردی سے اکڑے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ دباتی۔ وہ بہت آرام محسوس کرتا اس کے پاؤں گرم ہونے لگتے۔ اینٹھن کم ہو جاتی۔ میٹھا میٹھا سا درد رہتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی پاؤں دباتی رہتی۔ "اب چھوڑ بھی مجھے تو آرام ہو گیا۔ اب تیرے

پاؤں دبا دوں۔" وہ اُٹھ بیٹھتا۔ وہ لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لیتی۔" ارے کیا غضب کرتے ہو۔ گنہگار بناتے ہو مجھے۔" اور جلدی سے چولھے کی طرف کھسک جاتی۔ پتلا رالہ تیار کر کے، وہ مٹی کے پیالوں میں لے آتی اور وہ دونوں اپنی بیٹیوں، نواسے، نواسیوں کی باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ رالہ پینے لگتے۔ ٹھنڈ میں یہ گرم گرم رالہ پیتے ہوئے انہیں بہت لطف آتا تھا۔ گھونٹ حلق سے اترتے ہی سینہ میں خون گرم ہو جاتا۔ رگ رگ میں گرمی سرایت کر جاتی۔ پھر وہ ہنڈی برتن دھو دھا کر قرینے سے "اٹھالے" پر جوڑ دیتی۔ اور آپ کمبل اوڑھ کر پڑھ رہتی۔ وہ کتنی پھرتی سے کام کرتی۔ کیسی چھریری چست بدن کی تھی۔ تین بڑی بڑی بیٹیوں کی ماں جوان لگتی تھی۔ اس کی عمر بھی کونسی گئی تھی۔ دو تین سے کچھ کم ہی۔ بیٹیاں گیارہ برس میں بیاہ دی گئیں۔ اس لئے اتنی جلد نواسوں نواسیوں والی ہو گئی۔ اسے اپنے سہاگ کا بہت خیال تھا۔ اس کے سامنے ہمیشہ بن سنور کر رہنا پسند کرتی تھی۔ بوڑھے کی آنکھوں میں اس کی تصویر پھر گئی۔ ہاتھوں میں چاندی کی پہونچیاں، ہری ریشم کی چوڑیاں، گلے میں ہنسلی، ناک میں تین نگینوں کی نازک سی "چاندنی"۔ اس تپلی ناک پر کیسی بھلی لگتی تھی۔ یہ "چاندنی" اس نے آخری دنوں بہت چاؤ سے بنوائی تھی۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ باریک سوسی کا لہنگا چھینٹ کی سفید میدان والی دامنی اور ہلکے رنگ کی چولی۔ دلہن سی لگتی تھی۔ بیگم اسے رم جھم رم جھم دلہن کہا کرتی تھیں "کیوں فخرو میاں

تمہاری رم جھم رم جھم دلہن بہت دنوں سے نہیں آئی۔ تمہاری گھر والی یہاں
آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے فخرو میاں جیسے کوئی چھوکری پاؤں میں پازیب پہنے
چھم چھم کرتی چلی آ رہی ہے۔ سچ فخرو میاں مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ اتنی بڑی
بیٹیوں کی ماں ہے۔" بیگم اچھے دل کی عورت تھیں لیکن پھر بھی جب کبھی خان صاحب
کے گھر کا خیال آتا، اسے نفرت محسوس ہوتی اس گھر میں اس کی عزت پر حرف
آیا تھا۔ وہ چھ سال ان کے ہاں کام کرتا رہا۔ وہ آفس کا نوکر تھا۔ انہیں کیا
حق تھا کہ گھر کا کام لیں۔ لیکن وہ کبھی گھر کا کام بھی کرتا انہوں نے اسے نہیں پہچانا
اسے جھوٹا کہا۔ وہ غریب سہی لیکن اپنی بات کا پکا تھا۔ اتنے بار کہنے پر بھی
وہ اسے جھوٹا مانیں اس کا دل جل اٹھا تھا۔ پھر اسے گالی دی، یہ تو حد تھی،
اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طرف سے اسے رزق ملتا تھا۔ ان کا نمک
کھایا تھا۔ لیکن اس کے بدلے میں کیا وہ دیتا نہیں تھا۔ دن بھر تو کام پر جتا رہتا
تھا۔ ان کا کوئی احسان تو اس پر نہیں تھا۔ پھر انہیں کیا حق تھا کہ اسے گالی دیں؟
صرف اس بنا پر کہ وہ غریب تھا۔ بے بس تھا۔ اور وہ کچھ مالدار ہونے کی حیثیت
سے اس سے اونچے تھے۔ انہیں گالی دینے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اسے نیچ
کیوں سمجھتے تھے؟ "نسلِ حرام" کیسی گالی! اس کے رگوں میں شریفوں کا خون
تھا۔ وہ اتنی ذلت سہہ کر وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسی وقت تنخواہ لیے
بغیر وہاں سے چلا آیا۔ پھر وہ کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔ گو بیگم نے کئی دفعہ بلوا

بھیجا تھا۔ ہاں وہ ان کی بیٹی ثریا کے ہاں کبھی کبھی جاتا تھا۔ ثریا بیٹی اسے بہت عزیز تھی، ان دنوں وہ اسے کندھوں پہ بٹھائے پارک لے جایا کرتا تھا۔ یا بازار کی سیر کرا لاتا۔ بچی بھی اس سے لگ گئی تھی۔ "چاچا، چاچا" کہتی گود میں آ بیٹھتی اور اس کی...... چھدری داڑھی کے بال نوچنے لگتی۔ کیسی ننھی سی تھی اس وقت۔ اب وہ خود دو ننھے بچوں کی ماں بن گئی ہے۔ اب بھی وہ اس سے بہت اچھا سلوک کرتی تھی۔ ہنس کر بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی تھی جب وہ اپنا دکھڑا بیان کرتا تو سچی ہمدردی سے سنتی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ دو گھڑی اس کے ہاں بیٹھ آتا۔ ثریا بیٹی اسے پہچانتی تھی اسے انسان سمجھتی تھی۔ خان صاحب کے گھر میں ہی اسے چائے کی لت پڑی تھی۔ یہ منحوس لت جس نے اس کی بیوی کی تو جان لے کر چھوڑی تھی۔ وہ خان صاحب کے گھر میں کبھی کھانا نہ کھاتا تھا۔ اس کی تنخواہ "خشک" تھی۔ لیکن عیدوں میں اور کسی دن بیگم اصرار کرتیں "یہیں کھا لو فخرو میاں"۔ تو وہ کئی بہانے بنا دیتا۔ اس کے کام کے لئے روپے مل جاتے تھے۔ وہ ان کے گھر کھانا بھی کیوں کھائے اپنے گھر کی "آش ابیل" غیروں کے گھر کے پلاؤ سے بہتر ہے! البتہ ان کی خاطر سے اس نے دو ایک دفعہ چائے پی لی تھی۔ "دھوپ میں پھر پھرا کے آئے ہو چائے تو پی کر جاؤ۔" بیگم کہتیں۔ چائے کی ایسی "طلب" ہو گئی تھی کہ وہ گھر پر بھی چائے بنا کر پیتا تین تین چار چار بار پیتا اور اسے بھی پلاتا۔ اسے شکر کی بیماری ہو گئی تھی۔ وہ

سوکھتی چلی گئی تھی۔ بیماری کے دنوں میں بھی اس کی خدمت کیا کرتی تھی۔ وہ روکتا
پھر بھی نہ مانتی۔ "تمہاری خدمت سے میرا جی نہیں بھرا۔" وہ کہتی۔ "ذرا آرام کر نیک
بخت میں یہ کام کر لوں گا۔ ایسی تکلیف میں کاہے کو اتنا کام کرتی ہے، بس کر دو۔"
وہ اس کے ہاتھ پکڑ لیتی۔ "ارے بس تم جا کر چپ بیٹھ رہو۔ تب ہی مجھے چین رہتا
ہے۔ تمہارے دم سے سب کچھ ہے۔" وہ آنچل پھیلا کر دعا کرتی۔ "اللہ پاک
مجھے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی اٹھا لے۔" وہ ایسی ہی چلی گئی۔ اللہ نے
اس کی دعا سن لی۔ وہ تو چین سے سو گئی۔ وہی تکلیفیں اٹھانے کے لئے تنہا رہ
گیا ہے اس وقت اس کی کتنی ضرورت تھی اسے۔ وہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا۔
لیکن اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹیاں تو اپنے اپنے گھروں کی
ہو گئیں۔ وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تھا تو وہ ہر طرح اس کی خدمت کرتی تھی دلجوئی
کرتی تھی لیکن اب جبکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تھکا ہوا لوٹتا تھا۔ درد سے اس
کا انگ انگ ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دکھ درد میں کام آنے والی کہاں تھی؟

بوڑھا گھٹنے جوڑے آگے کو جھک کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
ابل آتے اور دو تین بوندیں ٹپ ٹپ گر کر فرش کی مٹی میں جذب ہو جاتیں۔
ہوا اور بھی زوروں سے چلنے لگی تھی۔ سرد جھونکے جھونپڑی میں گھس آتے ان
کی خنکی اس کی ہڈیوں میں اتر جاتی۔ ہڈیوں میں ٹیسیں اٹھتیں اور وہ کپکپا اٹھتا۔
آنسو پونچھ کر وہ اٹھا۔ چولہے میں دو اوپلے رکھے۔ اوپر سے سوکھی ٹہنیاں

اور دیا سلائی جلا کر پکڑ دی۔ ٹہنیاں آہستہ آہستہ سلگنے لگیں۔ اور وہ ہتھیلیاں پھیلا کر آگ تاپنے لگا۔ ایک دم ہوا زور سے چلی اور رُک گئی۔ دھواں دھار مینہہ برسنے لگا۔ ایک طرف چھت ٹپکتی تھی۔ پھوس کی چھت تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ ایسی ہوا میں اُڑ نہیں گئی۔ بوڑھا برتن، بھَلیے، ہانڈیاں، بوریئے وغیرہ نکال کر سوکھی جگہ رکھنے لگا۔ باہر سے کوئی دوڑ کر آیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ وہ برتن چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہُوا، اور دروازے کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ کون ہوگا اتنی برسات میں؟

"دروازہ کھولو بھیّرو دادا۔ میں ہوں جورا!"

بوڑھے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والے نے سر پر سے پھوس کا ایک گٹھا اتار کر نیچے رکھا۔ "کل بڑی تائی کہہ رہی تھیں دادا تمہاری چھت ٹپکتی ہے۔ پرسوں جو زور کی آندھی آئی تھی۔ اس میں ہماری ایک طرف کی چھت صاف اڑ گئی۔ کیا کریں دادا۔ آج کل چارہ بھی اتنا مہنگا ہے خیر ہوئی دو روز سے صرف بوندا باندی ہو کر چھوٹ گئی۔ زور کی برسات ہوتی تو کیا حالت ہوتی۔ آج میں نے کچھ کمایا تو آتے آتے بازار سے پھوس بھی لیتا آیا۔ آکر چھت جمائی۔ کچھ پھوس بچ رہا تو سوچا دادا کے گھر دے آؤں۔" وہ اپنی قمیص کا دامن جھٹک جھٹک کر سکھا رہا تھا۔

"آؤ یہاں سکھا لو اور آگ بھی تاپ لو۔"

بوڑھے نے کچھ ہٹ کر چولھے کے سامنے اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ چولھے میں اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے شعلے اٹھ رہے تھے۔ سب شعلے لپک کر مل گئے۔ اور آگ بھڑک اٹھی۔ نوجوان بوڑھے کے بازو آ بیٹھا۔ اور آگ تاپنے لگا۔ اتنی برسات میں کیوں آئے بٹیا؟ کل صبح لے آتے۔" "نہیں دادا ایسے زور کی برسات پڑھ رہی تھی، ساری جھونپڑی بھیگ جاتی تو تم رات کیسے گذارتے؟ یہ سوچ کر چلا آیا۔ اور جلد ہی آتا۔ پر کیا کروں ہماری چھت "چھانا" تھا۔ ایک طرف کی پوری چھت اڑ گئی تھی۔ دادا شام سے چڑھ بیٹھا ہوں۔ اب کہیں ختم ہوا چھانا۔ ختم ہوتے ہی پھوس لے کر یہاں چلا آیا۔ کیا ہوا دادا میں زیادہ تو نہیں بھیگا۔ کونسی دور سے آیا ہوں۔ یہیں پڑا ہے ہمارا گھر دو قدم پر!"

"پھر بھی بٹیا۔ تمہیں خیال رکھنا چاہیئے ایک بھلا ہی اوڑھ آتے۔ ابھی جان جوان لڑکے ہو۔ ہمارا کیا اب رہے اب گئے۔"

"میرا بھی اس دنیا سے جی بیزار ہو گیا ہے دادا۔"

"نہ، نہ ایسا کیوں کہتے ہو بٹیا۔ اللہ تمہاری حیاتی بڑی کرے۔"

"کیا کروں دادا، گھر والی تو بستر پکڑ کر رہ گئی۔ جب سے یہ بچی ہوئی ہے۔ وہ اٹھنے بھی نہیں پائی۔ ایسی اولاد ہونے سے نہ ہونا بہتر۔ ماں کی جان لینے پیدا ہوئی۔ بڑی جان سلامت رہے تو کئی بچیاں ہو سکتی ہیں۔ اور بچی بھی کیسی مریل، سدا کی روگی۔"

شکست

"سچ میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ کیسی ہے بہو؟"

"ویسی کی ویسی ہی ہے دادا مجھ سے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

غفلت نہ کر بیٹیا! بہو کی کچھ دوا دارو کر، جب گھر والی نہ رہے تو گھر کی رونکھ بھی گئی۔ اسی کے دم سے سب کچھ ہے بیٹیا۔"

"ہاں دادا، روز یہی چنتا لگی رہتی ہے۔ میرا تو سکھ چین اڑ گیا۔ کیا کروں کھانے پینے تک کی تکلیف تھی۔ کبھی سارا دن بھوکے رہ جاتے۔ دوا کے لئے پیسے کہاں سے آتے دادا؟ لیکن آج میں نے بہت کمایا ہے دادا۔ ایک دو مہینے ایسی ہی کمائی رہی تو بس اس کا پورا علاج کرا دوں گا۔ تمہاری دعا سے اچھی ہو جائے تو...... دعا کرو دادا۔"

"ضرور بیٹیا، بوڑھے نے رومال کی گانٹھ کھول کر دو آنے نکالے۔ "یہ لے" جو اکسی دھیان میں محو تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ پھر اس نے مٹھی کھول کر دیکھی۔ "ارے یہ کیا دادا؟" "کچھ نہیں بیٹیا، بچی کو مٹھائی کھلا دے میری طرف سے، آج کل پھوس اتنا مہنگا ہے تو تو اتنا بہت اٹھا لایا ہے۔"

"نہیں دادا یہ اپنے پاس ہی رکھو۔ ہمیں بھی کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے ایسے وقت میں تمہارے ہاں سے مانگ لے جائیں گے۔ تم قیمت چکانے لگو تو تمہارے پاس سے کچھ مانگنے کو ہمارا جی کیسے ہو گا؟ پڑوس والے ایک دوسرے کے کام نہ آئے تو؟ —— ہاں دادا میں تو باتوں میں بیٹھ گیا۔ کہاں ٹپکتی ہے چھت؟

میں ابھی چھا دیتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ارے بیٹھ بیٹا جورا۔" بوڑھے نے کہا۔

"تو کیا چھائے گا چھت، میں چھاؤں تو دیکھنا ایک برس تک ہلے گی بھی نہیں۔" یہ نہیں کہ بوڑھا چھت چھانے میں ماہر تھا۔ اس نے یوں ہی یہ بات کہہ دی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے کسی پر بار ہو۔ وہ حتی الامکان اپنا کام آپ ہی کر لیا کرتا تھا۔ جب اس کے ہاتھ سے کوئی کام ہو سکے تو وہ خواہ مخواہ کسی کا احسان کیوں اٹھائے۔ اگر وہ دوسروں پر بھروسہ کرتا رہے اور اپنا کام انہیں کرنے دے۔ تو وہ بہت جلد محتاج ہو جائے گا۔ اور وہ آخری دم تک کسی کا محتاج ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں دادا بہت مضبوط چھا سکتا ہوں دیکھو گے۔" وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارے بیٹھ بیٹا تجھ سے بہت ضروری بات پوچھنی ہے۔ اب تو بارش بھی تھم گئی۔ اب چھانے کی کیا ضرورت۔ کل چھا لیں گے۔" جورا بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے دادا۔"

ابھی تو کہہ رہا تھا نا آج تو نے بہت کمایا ہے۔ تیری تائی تو کہتی تھی تو بہت دنوں سے بیکار ہے۔ اب کیا کام ہاتھ لگا۔"

محلہ میں لکڑی کی ڈپو کھلی ہے۔ دادا تمہیں معلوم نہیں اب تک؟ ارے ڈپو کیا کھلی ہم غریبوں کے نصیب کھل گئے۔ خوب پیسے ملتے ہیں۔ ڈپو کھلے تین چار دن ہوئے اب سارے محلے کے جوان وہیں ٹوٹ پڑتے ہیں کتنوں نے اس کا

فائدہ دیکھ کر اپنی نوکریاں چھوڑ دیں اور وہیں جانے لگے اور سب کو کام ملتا ہے، دادا۔ یہ نہیں کہ ایک کو کام ملے اور دوسرا منہ دیکھتا رہ جائے۔ کتنے بھی آدمی جائیں سب کو کام مل جاتا ہے۔"

"کہیں اگر پیسے زیادہ ملتے ہوں تو محنت بھی زیادہ ہو گی نا؟ ڈپو کی منوں لکڑیاں پھاڑنا ہوں گی جب جا کر ڈپو کا مالک پیسے دے گا۔"

"نہیں دادا پیسے زیادہ ملتے ہیں اور کام کم ہوتا ہے۔ پہلے ایک گاڑی لکڑی چیریں تب جا کے کہیں ایک روپیہ ہاتھ آتا تھا۔ لیکن اب ایک روپے کی لکڑی پر تین آنے دیئے جاتے ہیں۔ اگر باریک چیریں تین آنہ اور موٹی چیریں تو ڈھائی آنہ۔ اور پھر گھر تک اٹھا لے جانے کی مزدوری الگ۔ ایک روپیہ کی لکڑی پر دو آنے کے حساب سے خوب ملتا ہے۔ ہم ڈپو کے لئے لکڑی نہیں پھاڑتے دادا۔ اس کے لئے علیحدہ مزدور ہیں۔ پر ڈپو سے چری ہوئی لکڑیاں کون لیتا ہے دادا۔ اتنی مہنگی پڑتی ہے۔ روپے میں صرف سوا دو من۔ کندے روپے میں، سرو کی لکڑی ہو تو سوا تین من۔ معمولی لکڑی ہو تو ساڑھے چار من ملتے ہیں۔ اس لئے سب کندے ہی خریدتے ہیں۔"

ایسا ہے تو کل تمہارے ساتھ چلوں گا بیٹا۔ کتنے دنوں سے کام کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں۔"

"تم چلو گے دادا، اتنی سخت محنت کا کام کر سکو گے؟"

"کوشش کروں گا بیٹا۔ میں بوڑھا ہوں تو کیا "گٹھ مٹھ" ہوں۔ سدا محنت کرتا رہا۔ اسی لئے تو بدن ڈھیلا نہیں پڑا۔ میں پہلے بھی یہ کام کر چکا ہوں بیٹا۔ کونسا کٹھن کام ہے جو میں نے نہیں کیا۔ لکڑیاں پھاڑیں بھٹیسن میں قلی بن کر کام کیا جب خان صاحب کے ہاں تھا کڑی دھوپ میں میلوں پھرنا پڑتا تھا۔ کبھی میں بھی سکھ چین سے رہا کرتا تھا"۔ بوڑھے نے ایک سرد آہ بھری۔ "گائیں بھینسیں تھیں دودھ پر گذر ہو جاتا تھا۔ سیروں دودھ دیتی تھیں۔ گھر والی گھر کے لئے بھی دودھ رکھ لیتی۔ چھاچھ، دہی بناتی مکھن نکالتی، بال بچے زیادہ ہو گئے تو نوکری کرنی پڑی۔ لیکن خان صاحب کے گھر سے نکلا تو پھر نوکری نہیں کی۔ گھر والی کہتی، ایسے محنت کا کام کیوں کرتے ہو، کہیں نوکری کر لو۔ کتنے ہی آدمی آکر کہتے فلاں گھر میں نوکر کی ضرورت ہے، پر میں نہیں گیا۔ پھر کسی کی غلامی کروں یہ نہیں ہو سکتا"۔

"بڑے ہمت والے ہو دادا تم۔ اتنے بڑھاپے میں بھی آپ ہی کما کر کھاتے ہو تائی ماں کہتی ہیں تمہاری تین بیٹیاں ہیں۔ کوئی بیٹا نہیں دادا؟"

"کوئی بیٹا ہوا ہی نہیں، میرے نصیب! تینوں کے تینوں بیٹیاں، ان میں سے ایک تو مر گئی۔ ایک ہوسلی کو دی گئی ہے۔ دوسری یہیں رہتی ہے منڈی محلہ میں"۔

"تب تو بیٹی کے ہاں کیوں نہیں جاتے دادا؟ یہ تمہارے کمانے کے دن ہیں؟"

بوڑھے نے سر ہلایا۔ "میں جیتے جی کبھی کسی پر بار بن کر نہیں رہوں گا میرے بیٹا بھی ہوتا تو اس کی کمائی پر پڑے رہنا میں مناسب نہ سمجھتا۔ بیٹی کے ہاں پڑا رہوں،

داماد کے ٹکڑوں پر۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ جب تک ان ہاتھوں میں دم ہے خود کما کر کھاؤں گا..... اللہ! ایسی موت دے کہ آخری دم میں بھی کسی کا محتاج بن کر بستر میں نہ پڑا رہوں۔ بس بیٹھے بیٹھے موت آجائے۔ ہردم یہی دعا ہے بیٹا۔"

ہاں دادا، ایشور ہر کسی کو ایسی موت نصیب کرے۔" جوزا بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے کہا۔" بہت دیر ہو گئی جاتا ہوں دادا۔ گھر والی راہ دیکھ رہی ہوگی۔"

"اچھا بیٹا۔"

آگ تاپ کر بوڑھے کا جسم اب گرم ہو چکا تھا۔ اُس کی اداسی دور ہو چکی تھی۔ اُٹھ کر اپنی کلہاڑی ڈھونڈنے لگا۔ اب وہ خوش تھا کیونکہ وہ کل کام پر جائیگا۔ بہت دنوں سے بیکار تھا۔

اس کی جمع کی ہوئی پونجی سے بھی اسے خرچ کرنا پڑا تھا۔ وہ ان دنوں دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتا تھا۔ ایک گولاہٹ یا چاول کی ایک روٹی اور چٹنی، پھر بھی اس کی پونجی آہستہ آہستہ کم ہوتی آرہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے آج ایک پیسہ کل ایک پیسہ بچا کر یہ پونجی جمع کی تھی۔ کہ اس کے آخری دنوں میں کام آئے۔ جب اس کے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہ رہے اور کمانے کے قابل نہ رہے تو وہ بیٹی کو یہ روپیہ دے گا۔ اور اس کے گھر رہے گا۔ بیٹی جو کچھ پکائے گی اُسے بھی کھلا دے گی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کی خوشی سے خدمت کرے گی۔ اُسے خوشی سے

کھلائے گی لیکن اس پر اس کے خرچ کا بار کیوں پڑے اور یہ روپیوں کی پوٹلی اس کے ہاتھ دیدے گا۔ بس اسے اور کتنے دن جینا ہے۔ باقی عمر کے لئے یہ پونجی کافی ہوگی۔ اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے لئے بھی بیس روپے الگ کر رکھے تھے۔ اسی پونجی میں سے بہت سا روپیہ خرچ ہوگیا تھا۔ جب وہ خوش تھا کہ اگر جورا کے کہنے کے مطابق اتنا مل جاتا ہے تو وہ کھا پی کر بہت کچھ بچا سکے گا۔ کلہاڑی ایک کونہ میں تھیلیوں کے نیچے پڑی مل گئی۔ اس نے کلہاڑی پاس ہی رکھ کر بوریا بچھایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ رہا۔

صبح اٹھ کر کلہاڑی خوب گھس گھس کر تیز کی۔ اور جورا کی گھر کی طرف چل پڑا۔ جورا بھی ابھی ابھی ناشتہ کر کے کلہاڑی لئے باہر نکل رہا تھا۔ "چلیں گے دادا؟" وہ باہر آتے ہوئے بولا۔ دونوں خاموش چلتے رہے۔ ڈپو دور نہ تھی۔ جلد ہی مل گئی۔ "ابابا کتنے لوگ ہیں بیٹا؟" بوڑھے کی آنکھیں تعجب سے کھل گئیں۔

"تو کیا عورتیں بھی آتی ہیں؟" "ہاں اور ان کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے پہلے ان کے لئے لکڑی تول دی جاتی ہے۔ ان کا نمبر بعد کا ہو تو بھی —— پر عورتیں بہت کم آتی ہیں۔ پرسوں کی بات ہے کہ ایک عورت بھی آگئی۔ دوکاندار نے اسے روک کر کہا۔ "ذرا ٹھہر و پہلے ان مائی کو دے دوں۔ عورتوں کا کام پہلے چکا دینا چاہیئے۔" اس آدمی نے چڑ کر کہا۔ "اچھا ایسا ہے تو ہمیشہ میں اپنی جورو کو ہی بھیجا کروں گا۔" ایسا قہقہہ پڑا۔

اب وہ ڈپو کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ دوکان کے سامنے بیچ میں لوگ قطار باندھے کھڑے تھے۔ اپنے اپنے نمبروں کے مطابق دائیں طرف لکڑی تولنے کی بڑی ترازو تھی اور ڈپو کے نوکر تول رہے تھے۔ دوسری طرف لکڑی اٹھا لے جانے والوں اور چیرنے والوں کی ٹولی کھڑی تھی۔ وہ دونوں جا کر اس میں شامل ہو گئے۔ جب کسی کا نمبر پکارا جاتا وہ آگے بڑھ کر کوپن اور نمبر دیتا۔ اس کے لئے لکڑی تول دی جاتی۔ غریب ہو تو آپ ہی اٹھا لے جاتا۔ غریب خریدتا بھی کتنی کوئی آٹھ آنے کی۔ بڑے آدمیوں کے نوکر بھی آتے تھے، تلوا کر آپ ہی اٹھا لے جاتے اور کچھ مزدوروں کے سر پہ ڈھلوا دیتے۔ وہی آتے تو سب لکڑی مزدوروں سے اٹھوا کر پہنچا دیتے اور بوڑھا ان سے لکڑی اٹھا لے گیا۔ ایک دفعہ وہ بہت تھک گیا۔ نوجوان نے اس کے لئے تین آنے پر ڈپو کی گاڑی بات کی۔ یہ ایک چھوٹی سی گاڑی تھی۔ جس میں چند من لکڑی ڈال کر ایک آدمی کھینچ سکتا تھا۔ ایسا ہی اُس نے پہلے دن تین روپیہ کمائے۔ اتنے دن بیکار رہنے کے بعد ایک دم تین روپے ہاتھ لگیں۔ وہ بہت خوش ہو گیا۔ اور اس نے سوچا کہ ضرور اپنی بیٹی کے ہاں جا کر نواسے اور نواسیوں کو دیکھ آؤں گا۔ اور ثریا بیٹی کے ہاں بھی جاؤں گا۔ وہ سن کر بہت خوش ہو گی۔ اس کی بیکاری کا حال سن کر کتنا افسوس کرتی تھی۔

دوسرے روز اس نے چار آنے کے موتی چور لڈو لئے اور بیٹی کے ہاں گیا۔ بیٹی نے بوریا بچھا کر اُسے بٹھایا اور شکایت بھرے لہجے میں کہنے لگی "تم تو آتے

ہی نہیں بابا۔"

"آتا تو ہوں بیٹی۔ پرسوں سے ذرا طبیعت خراب تھی۔"

"طبیعت خراب تھی۔ یہاں کیوں نہیں چلے آتے بابا۔ وہاں تمہیں دیکھنے والا کون ہے؟ خدا نہ کرے کہیں بیمار ہو جاؤ تو! کوئی کیا کہے، کیسی بیٹی ہے۔ بڑھاپے میں باپ کو یوں چھوڑ رکھا ہے۔"

وہ دونوں نواسوں کو گود میں بٹھلائے لڈو کھلا رہا ہے۔ اس کی بیٹی کپڑا بچھا کر کھانا نکالنے گئی۔ "میں کھانا گھر پر کھا آیا ہوں۔"

"جاؤ بابا تم تو ہمارے گھر کھاتے بھی نہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانا بناتے ہو۔ دیکھو آج تمہاری خاطر مچھلی پکائی ہے۔ کل ہمارے پڑوس والے تالاب میں مچھلیاں پکڑنے جا رہے تھے۔ میں ان سے بولی۔ "تم بھی جا کر ڈوک مچھلیاں پکڑ لاؤ۔ بابا بڑی چاہ سے کھاتے ہیں۔ ابھی سالن پک کر تیار ہوا ہے۔ بچے کو تمہارے گھر بھیجنے ہی والی تھی تم ہی آ گئے۔ آؤ بابا کھا لو۔" وہ سالن کا کٹورا دستر خوان پر رکھتے ہوئے بولی۔

وہ آج انکار نہ کر سکا۔ وہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا تھا۔ "میں گھر پر کھا آیا ہوں۔ پیٹ اتنا بھر گیا ہے کہ اب اور کھانے کی جگہ نہیں۔" کبھی یہ کہہ کر ٹال جاتا۔ "مجھے سنگے کی بھیلی کا سالن پسند نہیں بیٹیا۔ کبھی کریلا پکائے تو دیکھو ضرور کھاؤں گا۔" وہ کریلا پکا کر بھیجتی تو کوئی اور بہانا۔ ایک وقت کا کھانا کبھی کھا لے

تو کیا ہوا۔ لیکن وہ بھی غریب تھے۔ ایک وقت کا ایک آدمی کا کھانا کیا مفت میں آجاتا ہے۔ اگر بیٹا ہو تو بات الگ تھی۔ ”جنوائی“ کے ہاں کھانے کو وہ شرم کی بات سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ بہانا بنا دیتا۔ بہت ہوا تو کبھی آپ ہی مچھلیاں پکڑ لاتا۔ ”لے پکا دے بیٹا، تو مچھلی کا سالن بڑا مزیدار پکاتی ہے۔“ اور جب پک چکتا تو ضرور وہاں کھا لیتا۔ ”دیکھ بیٹا میں نہیں کھا رہا ہوں کیا تیرے گھر۔“ کبھی بیٹی اس کے انکار سے بہت رنجیدہ ہو جاتی تو دو ایک نوالے نام کو کھا لیتا۔ لیکن جاتے وقت بچوں کے ہاتھ میں دو چار آنے رکھ دیتا۔ یا بیٹی کے لئے سات آٹھ آنے والی سستی چھینٹ کی چولی کے لئے پونہ گز لے آتا۔ اس سے اس کے دل کو اطمینان ہو جاتا کہ اس نے معاوضہ ادا کر دیا ہے۔

”آج یہیں ٹھہر جاؤ بابا، کل چلے جانا۔“ بیٹی نے جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بس پانچ منٹ بیٹھ کر چلے جاتے ہو۔ دو ایک دن ٹھہرتے بھی نہیں۔“ داماد نے بھی اصرار کیا ہے۔ بوڑھا لوٹا لئے باہر صحن میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ ”نہ بیٹا اور کبھی آؤں گا۔ آج مجھے ثریا بیٹی کے ہاں بھی جانا ہے۔ اس نے کندھے پر سے رومال نکال کر منہ پونچھا۔ اور بچوں کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر جلدی ہی آجاؤں گا بیٹا۔“ بچوں کے ہاتھ میں چپکے سے دو دو آنہ رکھ دیئے۔ اور انہیں اتار کر باہر چلا گیا۔

باہر دھوپ بہت سخت ہو چلی تھی۔ اور ثریا کا گھر بہت دور تھا۔ اس

نے سوچا گھر جا کر کچھ آرام کرے۔ پھر وہاں جائے۔ لیکن یہ تین روپے آخر اس کے کب تک کام آئیں گے۔ چار آنے تو ابھی ابھی خرچ ہو گئے۔ وہ آج بھی شام میں ڈپو جا کر کچھ کمائے گا۔ ابھی ثریا بیٹی کے ہاں جائے تو بہتر ہے۔ ساڑھے دس بجے اور ابھی سے اتنی گرمی پڑ رہی تھی۔ رات کو زوروں کی بارش ہوتی اور دن میں بلا کی حرارت رہتی۔ ثریا کا گھر بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ وہ پیچھے کے دروازے سے سیدھا دالان میں چلا آیا۔ "ثریا بیٹی جیتی رہو۔" وہ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"بہت دنوں بعد آئے فخرو چاچا؟"

"ہاں بیٹی کیا کروں۔ فرصت ہی نہ تھی کتنے دنوں سے کام کے لئے مارا مارا پھر رہا تھا۔"

"بڑی ہمت والے ہو چاچا۔ اب تک اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتے ہو"

ثریا کا ڈیڑھ سالہ بچہ آنگن میں کھیل رہا تھا۔ بوڑھے نے اسے گود میں اٹھانا چاہا۔ بچہ دوڑ کر رومال کھولنے لگا۔ مٹھائی دیکھ کر بچہ اس کی گود میں آ بیٹھا۔ کبھی تم بھی ایسے ہی میری گود میں آ بیٹھتی تھیں بٹیا۔ میری گود کی کھلائی ہوئی بٹیا۔ اب اللہ کے کرم سے خود بال بچے والی ہو گئی ہو۔" اس نے نہایت پیار اور شفقت سے ثریا کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ "تم تو مجھے اپنی بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہو بٹیا۔" اور حقیقت میں وہ ثریا کو اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ چاہتا تھا

لیکن وہ بولتا بولتا رُک گیا۔ اگر وہ اسے خوشامد سمجھ لے تو؟ پیسوں والوں کی تو ہر کوئی خوشامد کرتا ہی ہے۔ ایسے کیوں معلوم ہو کہ وہ دل کی بات کہہ رہا ہے اس نے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔ ثریا اپنے بچے کو لڈو کھلاتے دیکھتی رہی۔ کتنا عجیب ہے اس کا مخروچاچا! دوسرے کوئی غریب آتے ہیں کچھ نہ کچھ مانگ کر ہی لے جاتے ہیں۔ کچھ مانگنے کی بجائے خود ہی مٹھائی لاکر بچے کو کھلاتا ہے۔ اس نے آج تک اس سے کبھی پیسے نہ مانگے تھے۔ وہ خود ہی رحم کھا کر دو چار آنے دینے لگتی تو کہتا۔ ”نہیں بٹیا اللہ کا دیا گھر پہ بہت ہے۔ میں ایک ہی جان تو ہوں پالنے کے لئے گھر میں اور کون ہیں بس جو کچھ کماتا ہوں اس پہ گذر ہو جاتا ہے، زیادہ پیسے پاس ہوں خواہ مخواہ فضول خرچی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ رکھو بٹیا۔ کبھی ایسی ہی ضرورت پڑ جائے تو اپنی بیٹی سے پوچھنے میں کیا شرم!“ لیکن وہ ضرورت پڑنے پر بھی نہ پوچھتا تھا۔ ان دنوں اسے کوئی کام نہ چل رہا تھا۔ وہ آتا تو اپنا دکھڑا روتا۔ لیکن کچھ نہ مانگتا اس کے چہرے پر ایک ایسی خاموش بے بسی رہتی کہ اُسے رحم آجاتا۔ اور وہ جبر کر کے دو چار آنے دے دیتی۔ وہ مجبور ہو کر لے لیتا۔ لیکن اس کے بُشرے سے ثریا پہچان لیتی کہ پیسے یونہی لینا پسند نہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی کام تلاش کرتا رہتا۔ کہ اس کے صلے میں کر دے۔ ”ننھے کی گاڑی کہاں ہے ذرا بٹھا کر پھرا لاؤں“ خط وط ڈالنا ہے بٹیا۔ پوسٹ آفس راستے ہی میں پڑتی ہے، ڈال جاؤں گا۔“

اور ثریّا کو معلوم تھا کہ کوئی پوسٹ آفس اس کے گھر کو جاتے ہوئے نہیں ملتی۔ خط ڈالنے یہاں سے ایک میل جانا ہوگا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ ان دو چار آنوں کا معاوضہ چکا دینا چاہتا ہے۔ ”میں یہ پکا دوں گا بٹیا۔ میں نے بڑی بیگم کو پکاتے ہوئے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ بہت اچھا پکا سکتا ہوں بٹیا“ یا کبھی سب کمروں کے فرش ہی دھو دیتا۔ ”بڑی دُھول جم رہی ہے بٹیا۔ یہ کون کام کرتی ہے۔ تمہارے ہاں پاکی کا ذرا لحاظ نہیں“...... اس کی امّی کہتی تھیں کہ ان دنوں بھی جب وہ ان کے ہاں نوکری پر تھا کبھی ایک پائی بھی نہ مانگا کرتا تھا۔ ”ہم نے کیسے دیانت دار نوکر کو کھو دیا“ امّی ہمیشہ افسوس کیا کرتی تھیں۔ فخرالدین بڑا غیور رہتا۔ انہوں نے ایک دن گالی دی تو تبھی نکل کر چلا گیا۔ وہ اسے سمجھتے ہی نہ تھے۔ دوسرے نوکر ہر وقت انہیں پھسلاتے، ان کی خوشامد کرتے رہتے۔ ان کے پاؤں تلے بچھے جاتے۔ مکّار! اسی لئے ان کے دل پر چڑھ گئے تھے۔ مگر فخرالدین اپنا کام کر دیتا تھا اور بس۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو مختصر۔ بردبار لہجہ میں کہتا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ مغرور ہے۔ میں نے آج تک غریبوں میں اتنی غیرت نہیں دیکھی اپنی تنخواہ کے اوپر ایک پائی بھی نہ مانگا کبھی۔“ اتنا غیور، اتنا خوددار۔ واقعی وہ اس دنیا کے لئے نادر ہی ہے۔ اس دنیا میں جہاں افلاس نے انسانوں کو ذلت کی آخری حدوں تک گرا دیا ہے۔ چند ٹکوں کے لئے وہ کتنے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ کتنا جھوٹ بولتے ہیں بٹیا یہ کہہ کر پیسے مانگتا ہے کہ ماں کی لاش

پڑی ہے۔ تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ ایک ماہ بعد دیکھو تو ماں آ کر کنکیاں مانگ رہی ہے۔ چھوٹا بیٹا میری موت کی گھبراڑا یا ماں کیا تم سے یہی کہا اس نے؟ ایک عورت نے تو اپنے شوہر کی موت کی خبر اڑا دی تھی۔ کیا سہاگ کا بھی پاس نہیں انہیں۔ اُف کتنے گر گئے ہیں یہ لوگ اور مانگتے وقت کتنا ذلیل ہو کر گڑگڑاتے ہیں۔ اسے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ لمبی چوڑی دعائیں "اللہ تمہارے کمایاں میں برکت دے۔ مائی تیرا (سواگ) سہاگ بستا رہے۔ مائی تیرا پیٹ ٹھنڈا رہے۔" وہ بوڑھی جو اس کی بہنوں کو اسکول کو میں کھانا دے آیا کرتی تھی۔ جب کبھی اس کے گھر آتی ہے کتنی باتیں بگھارا کرتی ہے۔

"چھوٹی بی میرا تو ایسا جان پڑ گیا تھا تمہارے میں بس ہر لحظہ جی چاہتا جا کر چھوٹی بی کو دیکھ آؤں۔ کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی مجھے چین ہی نہ پڑتا۔ اس لئے آج نکل آئی۔ گھر تین میل پر ہے میرا۔ اتنا دور مجھ سے چلا نہیں جا سکتا۔ پھر تمہیں جو دیکھنا تھا۔ ننھے کی طبیعت خراب ہے۔ ہائے ہائے بچہ تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ کون رانڈ کی نظر لگی شہزادے کو۔ میں صدقے جاؤں۔ کیوں تھا انگریز کے تیوں.... تمہاری اماں بڑی دل والی ہے۔ کیا کہوں' اللہ ان کا پیٹ ٹھنڈا رکھے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیتی تھیں۔" ہونہہ تو اب آئیں مطلب کی طرف اور اشارہ بھی کہ تمہاری ماں دیتی تھیں۔ تم بھی دو۔ پھر جاتے وقت تو آنے

کا مطلب پورا ظاہر ہو جاتا۔ "بچوں کا صدقہ ایک دو آنہ دو چھوٹی بی۔ کیا کروں پان کی ایسی بری لت پڑ گئی ہے کہ ایک گھنٹہ نہ کھاؤں تو بے کلی رہتی ہے۔۔۔۔ دیکھو بی دامنی پھٹ کے چندیاں ہو گئی ہے۔ کوئی پھٹی پرانی ساڑھی ہو تو دیکھ رکھو"

"بٹیا دولہا میاں آئے نہیں ہافس سے؟"

"نہیں چاچا"

"تم دونوں کو ساتھ بیٹھے دیکھنے جی بہت چاہتا ہے۔ بٹیا۔ تم دونوں کو ساتھ دیکھتا ہوں تو بس جی خوش ہو جاتا ہے۔ دولہا بھی تمہارے جوڑ کا ملا بٹیا"

وہ شرما گئی اور بات ٹال کر پوچھنے لگی۔ "ہاں چاچا! تم کہہ رہے تھے کوئی کام ملا۔ کیا کام ملا؟"

"کوئی قائم کام تو نہیں بٹیا۔ ہمارے محلہ میں لکڑی کی ڈپو کھلی ہے۔ بس وہیں جاتا ہوں۔ کوئی بابو لکڑی اپنے گھر اٹھوا کر لے جانا چاہے تو اٹھا لے جاتا ہوں۔ اور چیر کر دے دیتا ہوں۔ اس طرح روپے کی لکڑی پر پانچ آنہ ملتے ہیں۔ کل تو میں نے ایک ہی دن میں تین روپے کما لئے بٹیا"—— بوڑھے کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں لیکن اس چمک کی طرف ثریا کا دھیان نہ گیا۔ اُسے ایک دھکا سا لگا۔ لکڑیاں چیرتا ہے! لکڑیاں چیرتا ہے؟ اس کی آنکھوں میں ایک لکڑیاں چیرنے والے لڑکے کی تصویر پھر گئی۔ اس دن وہ باورچی خانہ میں جاتے جاتے ٹھٹک گئی تھی۔ آنگن میں ایک لڑکا ان کی لکڑیاں چیر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر

کھڑی دیکھتی رہی۔ اُف کلہاڑی کی ایک ایک ضرب پر وہ کانپ جاتی تھی جب لڑکا کلہاڑی اٹھا کر کندے پر زور سے دے مارتا۔ اس کا چہرہ شدت کرب سے اینٹھ جاتا۔ اور سینہ سے ایسی آواز نکلتی جیسے دم اکھڑا جارہا ہو۔ وہ اس کے درد کا تصوّر کر کے کانپ جاتی۔ اس نے نوکر کے کہنے پر لکڑیاں بہت باریک چیریں تھیں۔ روپے پر اڑھائی آنے بات ہوئی تھی۔ جاتے وقت لڑکے نے پوچھا تھا۔ "لکڑیاں بہت باریک چیرا ہوں ماں دو آنے زیادہ دے دو۔" اس کا دل بے اختیار چاہا تھا کہ دو آنے دے دے، یہ دو آنے بھی اس کی تکلیف کے لیئے کم ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس کا کرب اس کی تکلیف دیکھی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے صرف ایک آنہ دیا تھا۔ اور اس پر اسے فخر ہو رہا تھا کہ اس نے ایک آنہ بھی بچا لیا۔ اور ایک آنہ زیادہ دے کر اپنی رحمدلی کا ثبوت بھی دیا تھا۔ اس نے دو آنے کیوں نہیں دیئے۔ آخر اس کے کرب کے سامنے دو آنے کی کیا حیثیت تھی۔ اس نے اس کرب کا اپنی آنکھوں سے مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن وہ دو آنے نہ دے سکی۔ آخر یہ کیا چیز ہے جو ہمارے رحم کے جذبے کو بھی کچل دیتی ہے؟ ہم اس بے حسی کے عادی ہو چکے ہیں۔ غریبوں کو پسینہ بہاتے دیکھ کر بھی تکلیف اٹھاتے دیکھ کر بھی ہم میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو ہم جان بوجھ کر ہمارے دلوں کو پتھر بنا لیتے ہیں۔ تاکہ ہمیں ان کی مزدوری چکاتے وقت زیادہ نہ دینا پڑے۔ آخر یہ کیوں ہوتا ہے۔ ثریا کی آنکھوں میں

وہی منظر پھر رہا تھا۔ وہ کلہاڑی اٹھا کر پوری قوت سے مارتے وقت کرب کی حالت میں چہرے کا بگڑ جانا، اور سینے سے ایسی آواز کا نکلنا! کیسا دردناک نظارہ تھا جیسے کوئی جانکنی کی حالت میں مبتلا ہو۔ اور وہ لڑکا تو بہت جوان تھا۔ کوئی اٹھارہ بیس برس کا۔ چوڑے سینے، اور مضبوط بازوؤں والا۔ جب اسی کی یہ حالت تھی تو اس بوڑھے پر لکڑیاں چیرتے وقت کیا گذرتی ہوگی۔ وہ اس تصور سے کانپ گئی۔

"چاچا! لکڑیاں چیرتے ہو چاچا!" وہ رقت سے بول اٹھی۔ اس کی خوبصورت پلکیں بھر بھر اٹھیں۔ ثریا بڑی زود حس لڑکی تھی۔

"کیا کروں۔ دوسرا کوئی کام نہیں ملا۔ اس پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے بٹیا۔"

"لیکن اب تمہارے کمانے کے دن ہیں چاچا؟" "تم کہتے ہو اس شہر میں تمہارے کئی رشتہ دار ہیں بیٹی بھی ہے۔ ان کے ہاں کیوں نہیں چلے جاتے تم کہتے ہو جیتے جی بیٹی کے گھر نہیں پڑ رہوں گا۔ کیوں کیا تمہاری بیٹی تمہیں بار سمجھتی ہے؟ اپنے باپ کو؟ تم نے اسے پالا پوسا بڑا کیا۔ بیاہ کر کے دیا۔ اب اس نے احسان بھول کر بڑھاپے میں باپ کو یوں چھوڑ رکھا ہے۔"

"نہیں نہیں بٹیا میری بیٹی ایسی نہیں۔ غریب سہی پر وہ دل والی ہے ہمیشہ کہتی ہے، اب یہاں آکر رہ جاؤ بابا! جو کچھ گھر میں کپتا ہے تمہیں بھی کھلاؤں گی

گویا تمہاری ایک جان سے ہم پر بار پڑ جائے گا؟ وہاں تمہیں دیکھنے والا کون؟
خدانہ کرے کہیں بیمار ہو جاؤ تو! جب جاتا ہوں یہی کہتی ہے۔"

"پھر تو تمہارا داماد بُرا مانتا ہے؟ ہاں شاید وہ تو غیر ہوا نا۔"

"نہیں بیٹا۔ بڑا اچھا بچہ ہے وہ۔ میری بچی پر جان چھڑکتا ہے۔ بڑا پیرت (پریت) کا جوڑا ہے۔ بیٹا ان کا، بالکل تم جیسا، دل سے پیار کرتا ہے۔ میری بیٹی کو۔ شہزادی کی طرح رکھتا ہے اُسے یہ شادی جلدا جلدی ہیں ہوئی تھی بیٹیا۔ اس کے مرنے کے دنوں میں وہ کہتی تھی "میں تو دو دن کی مہمان ہوں۔ اس بچی کی شادی بھی میرے آنکھوں کے سامنے ہو جائے یہی ایک ارمان ہے' وہ شادی تو دیکھ سکی لیکن وہ اس بچی کا سکھ نہ دیکھ سکی۔ رہتی تو کتنی خوش ہوتی بیٹیا۔ بڑی بیٹی کا دکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ یہ جلدا جلدی کی شادی ہی اچھی نکلی۔ بڑی بیٹی کی شادی بہت سوچ بچار کر کے کی تھی۔ تین چار سال تک بات چلتی رہی۔ میرے بھائی کے بیٹے کو ہی دیا۔ کہ بچی کہیں باہر نہ جائے اپنوں ہی میں رہے گی لیکن اس کے نصیب۔ چھوکرا ایسا خراب نکلا۔ وہ گھل گھل کر مر گئی۔ ایک ننھی بچی کو چھوڑ کر۔ چہلم بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے مرد نے دوسری شادی کر لی۔ بچی تین برس کی تھی بٹیا۔" بوڑھے کی آواز میں رقت آگئی۔ "بچی کو لا کر میرے پاس چھوڑ گیا۔ لو تمہاری بچی کو تم ہی پالو۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ بچی مینڈ رماں

(سوتیلی ماں) کے کاٹ سے تو بچ گئی۔ میں تب اکیلا تھا بٹیا۔ بچی کو پالا پوسا۔ بیاہ کر کے دیا۔ پیسے والے لوگ ہیں اس کی سسرال والے۔ پر بچی کو سکھ نہیں۔ ساس ہمیشہ کاٹ کرتی ہے۔ پیسہ ہو کر بھی بچی کو سکھ نہیں۔ پر میری چھوٹی بیٹی بڑے سکھ سے ہے بٹیا۔ اللہ جیتا رکھے اسے میرے جنوائی نے بڑے سکھ سے رکھا ہے۔ اور جب بیوی پر میا (محبت) ہو تو بیوی کے باپ کا بھی نہال ہے اسے۔ بیٹی کہتی ہے کہ وہ بھی ہمیشہ کہتا رہتا ہے۔

"بابا کو یہیں بلا لیں گے اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب کمانے کے دن ہیں ان کے؟ عمر بھر محنت کی۔ اب ایک طرف بیٹھ کر سکھ و چین کی زندگی گذارنے کے دن ہیں۔ آخر انہوں نے تمہیں اتنا دکھ اٹھا کر پالا ہے۔ اب تو تمہارا یہ فرض ہے کہ انہیں بڑھاپے میں سکھ دو۔ پر میری ہی غیرت نہیں قبولتی۔ بٹیا کسی کے گھر پر رہوں۔ جب تک ان ہاتھوں میں طاقت ہے خود کما کر کھاؤں گا——" "جب تم سے بالکل کام نہ ہو سکے تو؟——" "اس وقت کے لئے بٹیا میں نے کچھ جمع کر رکھا ہے۔ بس بیٹی کے ہاتھ دے دوں گا۔ اور اس کے گھر جا رہوں گا۔ باقی عمر وہاں گوشے میں بیٹھ، اللہ کی یاد میں گذار دوں گا۔ کافی روپیہ ہے۔ "موت مٹی" کے لئے بھی الگ بیس روپے رکھے ہیں۔ پھر بھی اتنا بچتا ہے کہ باقی عمر میرا خرچ چل سکے۔ آخر میں اب جیوں گا ہی کتنے دن۔"

بوڑھا یہ سب کچھ سادگی سے بول رہا تھا۔ اسے اپنی خودداری کا احساس تھا وہ جانتا تھا کہ غریبوں میں خودداری کا ہونا بڑی بات ہے۔ تاہم اسے اس بات کا غرور نہ تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ خودداری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔

اب جاتا ہوں بیٹا پھر کبھی آؤں گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، ثریا اس کی آنکھوں کو دیکھتی رہی —— "جیتی رہو بیٹیا۔ وہ چلا گیا۔ لیکن ثریا اب بھی گویا اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ رہی تھی۔ ان اندر کو دھنستی ہوئی بے نور آنکھوں میں بھی خودداری سے کیسی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ خدا کرے۔ یہ چمک یونہی قائم رہے۔ وہ اپنے بلند ارادے پر قائم رہ سکے اس دنیا میں تو انسان کے نیک ارادے بھی پنپ نہیں سکتے ۔ ناموافق حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ بے بس کر دیتے ہیں۔ پرسوں جب اس کے شوہر نے اپنے وکیل دوست کا قصہ سنایا تو اسے کتنا صدمہ ہوا تھا۔ ان وکیل صاحب نے عہد کر لیا تھا کہ وہ جھوٹے مقدمات کبھی نہ لیں گے کچھ دیر تک یونہی ان کی پریکٹس چلتی رہی۔ چند کیس آجاتے تھے لیکن آخر مؤکل ہی تو وکیل کے پاس آتے ہیں۔ وکیل مؤکلوں کو ڈھونڈتا نہیں پھرتا۔ مؤکل زیادہ تر مجرم ہی کی پارٹی ہوتی تھی۔ وہ ان کا کیس لینے سے انکار کر تے گئے۔ مؤکلوں کی تعداد بہت کم ہونے لگی۔ ان کی پریکٹس صفر کے برابر ہو کر

رہ گئی۔ قرضہ بھی ہو گیا۔ وہ بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ دوستوں نے انہیں ابھارا کہ آخر وکیل ہو کر اس کا امتیاز کیوں کرو۔ صرف حق والوں کے مقدمے جیت لئے تو کونسے بڑے لائر بن گئے۔ قابلیت تو جب ظاہر ہو گی کہ واقعات کو جھوٹا ثابت کرو۔ پھر وہ جھوٹے کیس لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پہلے پہل تو وہ بہت ملول رہا کرتے تھے۔ اس احساس سے کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہو گئے۔ اور اب مجرموں کے جرم کو چھپانے میں بڑے ماہر ہیں...... اُسے یہ سن کر کتنا افسوس ہوا تھا۔ یہ دنیا تو نیک ارادوں کو بھی پنپنے نہیں دیتی۔ لیکن وکیل صاحب نے بہت جلد ہار مان لی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ وہ پہلے مقدمے جیت کر کافی شہرت حاصل کر لیتے۔ اور لوگوں پہ یہ ظاہر کر دیتے کہ وہ صرف حق والوں کے مقدمے لیتے ہیں۔ تو ایسے ہی موکل ان کے پاس آتے۔ انہوں نے بہت جلد ہار مان لی۔ لیکن یہ بوڑھا اس قدر غریب، اس قدر کمزور ہو کر بھی کیسا جان توڑ مقابلہ کر رہا تھا۔ ان دنوں جب کئی مہینوں سے وہ بیکار رہا تھا۔ اس نے فاقے پر فاقے کئے تھے۔ اور اب لکڑیاں چیر کر گذر کر رہا تھا اسے اتنی تکلیف اٹھانی منظور تھی لیکن کسی کے گھر جانا منظور نہ تھا۔ کتنی غیرت کیسی خود داری! بوڑھے کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس چمک میں گویا انسانیت کی فتح تھی۔

شکست

ثریا دروازے میں کھڑی بہت دیر تک بوڑھے کو جاتے دیکھتی رہی۔ وہ گلی میں مڑ گیا۔ تو وہ اندر چلی آئی۔

وہ ہر روز ڈپو جاتا رہا۔ لکڑیاں وہ پہلے بھی چیرا کرتا تھا۔ اس لئے اُسے ایسے انداز سے ضرب لگانا معلوم تھا کہ لکڑی جلد چر جائے۔ اور اسے زیادہ تکلیف بھی نہ ہو۔ لیکن پھر بھی لکڑی چیرنا لکڑی چیرنا ہی تھا۔ وہ اب اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ کچھ وقفہ کے بعد وہ دم لے کر چیرا کرتا تھا پھر بھی اسے شدت کی تکلیف ہوتی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی چھاتی خالی ہوئی جا رہی ہے۔ کوئی اس کے بازوؤں کا گوشت اندر سے کھینچکر نکال رہا ہے۔ گھر آتا تو کندھے اور بازو بری طرح درد کر رہے ہوتے۔ لیکن جب وہ منہ ہاتھ دھو روٹی کھانے بیٹھتا تو اسے ایک عجیب تسکین، عجیب لذّت محسوس ہوتی۔ اپنے ہاتھ کی کمائی ہوئی روٹی کھاتے ہوئے وہ صرف دو گھروں کو جاتا۔ ایک ایک گھر میں چار روپے کی لکڑی تو چیرنی پڑتی تھی۔ خواہ مخواہ کیوں حرص کر کے تکلیف اٹھائے۔

پھر گرمی پڑ گئی اور لکڑیاں سوکھ گئیں۔ اب تک وہ ہمیشہ سرو کی لکڑیاں چیرا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ آسانی سے چیری جا سکتی تھیں۔ لیکن اب سرو کی لکڑیاں دوسری لکڑیوں سے کئی گنا سخت ہوتی ہیں۔

شکست

دوپہر کا وقت، کڑی دھوپ میں کھڑے، ایک دن وہ کسی گھر میں لکڑیاں چیر رہا تھا۔ سرو کی سوکھی ہوئی سخت لکڑیاں۔ لکڑیاں بہت گانٹھ دار تھیں۔ ایک ایک گانٹھ پھاڑتے اتنا وقت لگتا جتنے میں پہلے ایک روپیہ کی لکڑی چیر لیا کرتا تھا۔ سخت سے سخت ضرب لگانے پر بھی کلہاڑی اندر دھنستی نہ تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پسینہ میں شرابور۔ وہ اپنی پوری قوت لگا کر کلہاڑی مارتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے دم بھی اکھڑ جائے گا۔ پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ شدّتِ کرب سے اس کے سینے سے آواز نکل جاتی۔ لیکن ایک گانٹھ ایسی سخت تھی کہ پھوٹتی ہی نہ تھی۔ اس لئے کلہاڑی مضبوط پکڑ کر اوپر اٹھائی اور گانٹھ دے ماری سینے میں ناقابلِ برداشت درد اٹھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ سینہ تھام کر بیٹھ گیا۔

مالکۂ مکان ادھر آنکلی۔ اور اُسے چپ بیٹھا دیکھ کر کڑک کر بولی۔ ”کیوں بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ چار روپے کی تو لکڑی ہے۔ اتنی لکڑی پھاڑنے کے لئے بیچ میں آرام بھی چاہیئے جلد جلد چیر۔ آج شام ہمارے ہاں دعوت ہے۔ بہت لکڑی کی ضرورت ہوگی“

”میں نہیں چیر سکتا ماں۔ لکڑیاں بہت سخت اور گانٹھ دار ہیں۔ آدھی لکڑیاں چیری ہیں۔ اس کی مزدوری دے دو“ ”چیرنے ہاتھ نہیں ہوتا۔ تو پھر آیا ہی کیوں“ وہ غصہ سے دو آنے پھینکتی ہوئی بولی۔ ”دو ہی آنے ماں!

میں آدھی لکڑی چیرا ہوں۔ اور آج کل سبھی روپیہ پر چار آنے دیتے ہیں۔ اتنی سخت لکڑی کوئی چار آنے سے کم نہیں چیرتا۔ اس حساب سے آٹھ آنے ہوئے۔" "ہونہہ! یہ بھی بہت ہوئے، تجھے تو کچھ بھی نہیں دینا چاہیئے تھا تو نے دوہرا کام لگایا۔ اب پھر آدمی ڈھونڈنا ہے۔ ایک پائی زیادہ نہ دونگی۔" وہ پلٹ کر چلی گئی۔ وہ بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ کہ شاید پیسے لانے گئی ہے۔ لیکن وہ نہ آئی۔ وہ آہستہ سے چھاتی تھامے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُف اتنی محنت کے بعد دو آنے! آخر دولت ایسے لوگوں کو کیوں دی جاتی ہے۔ جو انصاف کرنا نہیں جانتے۔ وہ بہت دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دو آنوں کو دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی آنکھوں کو یقین نہیں آرہا ہو۔ وہ پھر انہیں مٹھی میں دبا کر خاموشی سے چلا آیا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شام کو اتفاقاً جورا آگیا تو اس نے دیکھا۔ بوڑھے کو سخت بخار چڑھا ہوا ہے

"اوہ تمہیں تو بخار چڑھا ہوا ہے دادا۔ کہو گاڑی لے آؤں، بیٹی کے گھر جاؤ گے؟" وہ نہایت ہمدردی سے پوچھنے لگا۔

میرے حال پر چھوڑ دو بیٹا۔ بس اتنے دن جی لیا۔ بیٹیوں اور نواسیوں کو پالا پوسا۔ ان کی شادیاں دیکھ لیں۔ بس اب اور کیا دیکھنا ہے. چین سے مرجاؤں تو......"

ایسا نہ کہو دادا۔ میں ابھی کسی اچھے حکیم کا انتظام کرتا ہوں۔ کہو

تمہاری بیٹی کو کہلا بھیجوں ؟"

"نہ بیٹا! اسے معلوم نہ کراؤ۔ پریشان ہو جائے گی۔ اور مجھے ہوا بھی کیا ہے۔ بس لکڑی ذرا سخت تھی۔ چھاتی میں درد ہو گیا اور اسی سے بخار آ گیا بس دو ایک دن میں اچھا ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے جنجال میں پریشان ہے، گھر گرہستی چھوڑ کر کیوں آئے۔"

ایک ماہ تک وہ بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ جب پوری صحت ہو چکی تو جوّرا نے اس کی دواؤں اور حکیم صاحب کی فیس کا حساب ادا کیا اور بٹوا واپس کر دیا۔ یہ بٹوا جس میں اس کی پونجی تھی۔ اس نے جوّرا کے حوالے کیا تھا کہ فیس اور دواؤں کے لئے اس میں پیسے لے لے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے بٹوہ کھولا۔ صرف پانچ روپے بچ رہے تھے۔ اسے ایک دھکا سا لگا۔ کتنے روپے خرچ ہو چکے تھے۔ یہ بٹوہ پھر سے بھرنے کے لئے اسے کتنے دن درکار ہوں گے۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ پھر کل ہی سے ڈپو جانا شروع کر دے گا۔ اب وہ تو لکڑیاں چیر ہی نہیں سکتا لیکن دو ایک گھر کو لکڑی اٹھا لے جا سکتا ہے۔ دو روپے کی لکڑیاں وہ ایک بار اٹھا سکے گا۔ زیادہ ہو تو تین آنے پر ڈپو کی گاڑی بات کرے گا۔

دوسری صبح وہ پھر ڈپو گیا۔ اب نقشہ بدل چکا تھا۔ پہلے محلے کے چند جوان ہی لکڑیاں چیرنے والوں کی ٹولی میں شامل تھے۔ اب جانے کہاں

سے اتنے آدمی آگئے تھے۔ کہ بس ایک بھیڑ بن گئی تھی۔ پہلے لکڑیاں
تلوا کر بابو لوگ خود قلیوں کو ڈھونڈا کرتے تھے لیکن اب لکڑی تلتے ہی
مزدور خود ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک آدمی کو تین چار مزدور گھیر لیتے تھے
میں اٹھا لوں گا سوامی" کہاں ہے صاب، گھر؟" خریدنے والوں کی بھیڑ
میں مزدور گھس جاتے تھے۔ وہ اتنی بھیڑ میں کیسے گھس سکے گا۔ لیکن دوسرے
گھس گھس کر گاہکوں کو لپک لیتے تھے۔ وہ دور ہی سے کسی گاہک پر نظر
جما رکھتا۔ کہ اس کی لکڑیاں تلتے ہی جا کر اٹھا لے گا۔ لیکن آن کی آن میں کوئی
گھس کر اٹھا لیتا۔ اور وہ منہ تکتا رہ جاتا۔ آخر بہت کوشش سے بچ بچا کر
وہ اندر کچھ دور تک گھسا۔ لیکن اتنی بھیڑ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے
دے رہے تھے۔ ہر طرف سے اس کے جسم پر بوجھ پڑ رہا تھا۔ وہ سنبھل نہ
سکا۔ طویل بیماری کے باعث وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں
تلے اندھیرا چھا گیا۔ بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا جب
اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ اپنے گھر میں تھا۔ محلہ کے لوگ اسے اٹھا لائے
تھے۔ اس کا انگ انگ درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ دوسرے روز سے اسے
ہمت نہ پڑی کہ بھیڑ میں گھسے۔ وہ یوں ہی کچھ دور کھڑا انتظار کرتا رہتا
کہ کوئی اسے دیکھ کر خود آ جائے۔ کبھی گاہک لکڑی لینے سے پیشتر اس
کے پاس سے گذرتا تو کہتا۔ لکڑیاں تلوا کر مجھے بلا ؤ صاب۔ میں لیجاؤں گا۔"

لیکن تلواتے ہی وہاں کوئی اور آکر اٹھالے جاتا۔ وہ ہر روز شام کو مایوس لوٹتا تھا۔ اس نے ان دنوں ایک پائی بھی نہ کمائی۔ اس نے بہت کفایت کی۔ پھر بھی پانچ روپے اس کا کب تک ساتھ دیتے۔ وہ دن دن بھر بھوکا رہنے لگا۔ طویل بیماری اور بیماری چھوٹتے ہی فاقے۔ وہ بیحد کمزور ہو گیا تھا۔ اگر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا بھی "لکڑیاں لے آؤں صاب" وہ مڑ کر دیکھتے اور اس پر ایک بے پروائی سے ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے چل دیتے۔ ان کی نظریں کہتی تھیں "ہوں کیا ہو سکے گا اس ڈھانچے سے کیا وہ لکڑیاں اٹھا سکے گا۔ چیرنا تو ایک طرف؟" وہ تندرست آدمیوں کو کام دیتے تھے۔ وہ بھوکا تھا۔ اس لئے کام کر کے کچھ کمانے آیا تھا لیکن اسے کام نہیں ملتا۔ اس لئے کہ وہ بھوکا تھا، کمزور تھا۔

اُسے خیال آیا کہ وہ ثریا بٹیا کے ہاں کیوں نہ جائے۔ اس کا چھوٹا موٹا کام کر دے تو وہ چار آٹھ آنے دیدے گی۔ ایسے ہی کچھ دن کھا پی کر طاقت عود کر آئیگی۔ اور کام کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ لیکن وہ اب اتنی دور کیسے جا سکے گا۔ ڈپو جاتے ہوتے ہی اُسے کئی بار چکر آجاتی تھی۔ ثریا کا گھر تو نظر آباد میں تھا۔ لیکن اسے جانا ہی پڑے گا۔ وہ آہستہ آہستہ جانے لگا۔ راستے میں بیٹھ بیٹھ کر کچھ سستا لے گا۔ وہ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین گھر پار

گئے۔ چوتھے گھر کے سامنے ایک لڑکا کھڑا اپنی گاڑی کے بیل باندھ رہا
تھا۔ اس نے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو بھکرو دادا؟"
"نظر آباد"
"اتنی دور دادا کیسے چل سکو گے؟ تم تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ آؤ میں
بھی اُدھر چل رہا ہوں آؤ۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ" اس نے تشکر آمیز نگاہوں
سے لڑکے کو دیکھا اور چڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ثریا کی گلی کا موڑ آیا "بس
یہاں ٹھہرا دو بیٹا۔ یہاں سے دو قدم ہی چلنا ہے۔ تم اپنی راہ جاؤ"
وہ اتر پڑا۔

ثریا بچے کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ
بہت جلدی میں ہے۔ گھر ویران رہ گیا تھا۔ بوڑھا حیرت سے اِدھر اُدھر
دیکھنے لگا۔ فرنیچر سامان کچھ نہیں تھا۔ "کیوں بیٹا گھر بدل رہی ہو؟" "نہیں
دادا ہم بنگلور جا رہے ہیں۔ ان کا تبادلہ ہو گیا۔" وہ بہت خوش نظر آ رہی
تھی۔ تبادلہ ہی نہیں پرموشن بھی یعنی اب جو کام کرتے تھے اس سے بڑا
کام ملا۔ سامان وامان لدوا کر اسٹیشن پہ بھیج دیا گیا ہے۔ وہ بھی سامان کے
ساتھ گئے ہیں۔ پہلے ہی ٹکٹ لے رکھیں گے۔ آج کل اسٹیشن پہ بہت بھیڑ
لگی رہتی ہے چاچا۔ ٹکٹ ملنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے لئے نوکر تانگہ لانے
گیا ہے۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا تھا چاچا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ کہو کیا

حال ہے اچھے ہو۔ بہت دنوں بعد آئے ہو۔" بوڑھے نے ایک سرد آہ کھینچی "کیا کہوں بٹیا۔ ایک مہینہ تو بستر پر پڑا رہا۔ ایسا بیمار پڑا۔ اور اب جو اٹھا ہوں تو ہاتھ میں کام کرنے کی طاقت نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا چاچا تمہیں۔ کیا بیمار تھے؟"

"کچھ نہیں بٹیا بس ایک دن ذرا سخت گانٹھ دار لکڑیاں چیریں تو چھاتی میں درد ہو گیا۔ اور بخار ایک مہینہ تک نہ چھوٹا۔ بڑھاپے میں کیا ہے بیٹا ایک ذرا سا حیلہ ہی بس ہے۔"

"میں نہ کہا کرتی تھی چاچا، ایسا کٹھن کام نہ کرو۔ تم سنتے ہی نہیں بس اپنی کئے جاتے ہو۔ اب تو سبق ملا؟ میں کہتی ہوں بس بیٹی کے گھر جا رہو تم نے اس وقت کے لئے پونجی تو جمع کی ہے!"

"وہ پونجی تو ساری ختم ہو گئی بٹیا ـــــ"

"کیسے چاچا؟" "یہی دوا دارو میں" "علاج میں اتنے روپے خرچ ہو گئے؟ کتنے تھے تمہارے پاس؟" "تین بیس سے کچھ کم ـــ" "اتنے روپے علاج میں؟" "نہیں بٹیا کچھ تو میری بیکاری میں صرف ہو گئے تھے۔ علاج پر بیس پچیس خرچ ہوئے۔ حکیم صاحب کی فیس اور دوا کے ملا کر۔ اور اس سے پہلے میں نے اپنے نواسے داماد کو بیس روپے کی سونے کی انگوٹھی خرید کر دی تھی ـــ"

"سونے کی انگوٹھی کی تمہارے داماد کو کیا ایسی ضرورت تھی۔ بڑی حماقت کی تم نے چاچا۔ یہ تو تمہارا ہی قصور ہے۔"

"میری بھولی بٹیا۔ تم دنیا کے طور کیا جانو، میرے دامادوں نے، سوائے میرے چھوٹے داماد کے اللہ اسے بستا رکھے، سب نے مجھے ایسا ستایا ہے، ایسا ستایا ہے۔ بس کہنے لگوں تو ایک رام کہانی ہو جائے۔ میرے ہی کیا سبھی دامادوں کا یہی حال ہے۔ جب ایک دفعہ بیٹی کو اٹھا کے دے دیا، تو بس ہمارا کیا ہے۔ داماد جو بھی کریں سہنا پڑتا ہے۔" بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "پہلی بیٹی کا مرد تو ویسا نکلا، اس کی مصیبت کی ماری بچی میرے ہاتھ پلی۔ اُسے بھی سکھ چین نہیں۔ ابلیس کی اولاد تین برس کی بچی کو میرے پاس چھوڑ گیا۔ پھر پھٹک کر نہیں دیکھا۔ بچی کی یاد بھی نہ آتی تھی بے رحم کو۔ اس نے بچی کو دیکھا تک نہیں۔ قریب بارہ برس ہونے کو آئے۔ اس کی شادی پر بھی نہ آیا۔ پرسوں بچی آئی تو رو کر کہنے لگی۔ ایسے سخت دل باپ کے لئے بھی اس بچی کے دل میں جگہ ہے۔ کتنا ہی ستائے آخر باپ ہی تو ہے۔ اللہ باپ کی میا مہر (محبت) دل میں ڈال ہی دیتا ہے۔" کہ کر کہنے لگی۔ "نانا! بابا کو دیکھے قریب بارہ سال ہونے آئے مجھے لے جا کر ایک دفعہ ان سے ملاؤ۔ بارہ برس پورے ہو جائیں تو ہم ایک دوسرے کو مرتے دم تک نہیں دیکھ سکتے۔"

"کیوں نہیں دیکھ سکتے ؟"

"تم ایسی باتوں کو ہنسی میں اڑادو گی بیٹا...... لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ قریب کے رشتہ دار کسی وجہ سے بارہ برس تک ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں تو بارہ برس گذر جانے پر انہیں ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھ پائیں تو دونوں میں سے ایک ضرور مر جائے گا۔ اس لئے رو کر کہہ رہی تھی بچی۔" بابا سے ملا دو بارہ برس ہونے آئے۔ وہ کیوں آئے گا اسے دیکھنے؟ بچی کو بلا لے جانا تھا۔ اس کا باپ دوسری شادی کر کے اب منگلور میں ہے۔ در یچے، دروازوں اور دیواروں پر رنگ کرنے کا کام کرتا ہے۔ اور بچی کا گاؤں بیچ میں پڑتا ہے۔ میسور اور بنگلور کے بیچ میں ہے۔ اس کی شادی ملوتی میں کی ہے۔ بچی کو لے جانا تھا۔ اس لئے گیا نہیں تو کاہے کو جاتا میں اس کے گھر۔ ایک ہی دن وہاں ٹھہرا مگر ایک ہی دن میں نواسے جنوائی کے لچھن معلوم ہو گئے۔ وہ ناحق بچی پر جھپٹ رہا تھا۔ "کیسی بے وارثی چھوکری آئی میرے نصیب میں۔ دوسرے داماددوں کو دیکھا۔ کیا خاطر داریاں کی جاتی ہیں۔ ان کی دلہن والوں کے گھروں میں دعوتیں دی جاتی ہیں تحفے دیئے جاتے ہیں۔ تیرا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ہے تو تیرا کنجوس بوڑھا نانا، کبھی ایک دفعہ بھی بلایا ہے مجھے۔ کبھی کوئی تحفہ دیا ہے۔ ابھی تک کمائے جاتا ہے حریص۔ بڈھا خوب پیسے جوڑ کر رکھتا ہوگا۔ دل نہیں ہوتا کہ داماد کو ایک تحفہ ہی دے دے۔

بخیل کہیں کا۔ اور تجھے جہیز بھی کتنا دیا؟ بس دو کوڑی کا۔ بول کتنا جہیز ساتھ لائی مہارانی کی بچی؟" اور یہ کہہ کر بیٹا، اس نے مٹی بھینچ کر انگوٹھا نکال کر بچی کے سر پر ایک ایسا دھول مارا کہ بچی درد سے تڑپ اٹھی۔ میں بازو کی کوٹھری میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بچی چپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے آواز تک نہیں نکالی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی گرتا رہا۔ اس کی آنکھوں کا پانی سوکھتا ہی نہیں۔ ساس بھی ہمیشہ کاٹ کرتی ہے۔ طعنے دیتی ہے کہ زیادہ جہیز نہ لائی۔ میری نواسی بیٹا۔ کیا کہوں کیسی ہے۔ ایسے نرم دل والی۔ ایسے صبر والی، پھر صورت میں ایسی پیاری ہے۔ بس پری کے تیوں۔ ایسی بچی سے یہ سلوک کرتے ہیں۔ دل نہیں دیکھتے۔ روپ نہیں دیکھتے بس پیسے پر نظر ہے۔" "اپنے نانا سے نہیں کہے گی کہ مجھے کوئی اچھا تحفہ دے۔" وہ پوچھ رہا تھا بچی نے روتے ہوئے کہا۔ "انہیں ستاؤ نہیں۔ وہ بہت غریب ہیں۔ بڑے دل والے ہیں میرے نانا۔ اگر ان کے پاس پیسے ہوتے تو ضرور تمہیں کچھ دیتے" .... اتنا ہونے پر بھی بچی نے مجھے جھگڑے کے متعلق ایک بات نہ بتائی۔ لیکن میں خود سن اور دیکھ چکا تھا۔ میری وجہ سے میری بچی پر اتنا ظلم توڑا جائے، میں یہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے آتے وقت داماد سے کہا۔ "اب کی رمضان ضرور میسور آنا میرے ہاں۔" "کیا دوگے؟" وہ اکڑ کر بولا۔ "میں ٹھیک سے نہیں بول سکتا۔" میں بولا۔ "کوئی کاشمیری رومال یا شال..... ہونہہ۔

کاشمیری رومال۔" وہ حقارت سے بولا۔ میں تو اس سے جوٹھا ہاتھ بھی نہ پونچھونگا کاشمیری رومال۔ بڑے گھر کو بیٹی دینا تھا تو بڑے گھروں کے آداب کا بھی خیال رکھتے" ذرا پیسے والے تھے بٹیا وہ۔ اِس بنا پر اپنے آپ کو وہ بہت بڑا سمجھتے تھے۔ "میں تو کم از کم سونے کی انگوٹھی لے کر رہوں گا" میں کیا کر سکتا بٹیا۔ بچی کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ وہ آیا تو بیس روپے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی...... پونجی ختم ہو گئی بٹیا۔ اب کیا منہ لیکر بیٹی کے گھر جاؤں۔ نہ بٹیا میں جاؤں گا نہیں۔ اب یہی کوشش کروں گا۔ اب بھی ڈپو جا رہا ہوں بٹیا لیکن تم میرا حال دیکھ رہی ہو۔ اتنے کمزور کو کون کام دے گا۔ ایک پائی بھی نہیں کمائی فاقے گذار رہا ہوں بٹیا۔ خیال آیا جا کے ثریا بٹیا کا کوئی چھوٹا موٹا کام کر دوں تو بٹیا کچھ دے گی!"

"کام کرنا ہی ہے کیا چاچا" وہ اپنی پرس ڈھونڈنے لگی۔ پرس تو اُس نے ٹرنک میں بند کر دی تھی اور سب سامان اسٹیشن کو پہنچ چکا تھا۔ اس غیور بوڑھے کی ایسی مصیبت کے وقت بھی مدد نہ کر سکے گی اسے بہت رنج ہو رہا تھا۔ اس کا شوہر بھی اب اسٹیشن سے نہیں لوٹے گا۔ ورنہ اسی سے کچھ مانگ کر دیتی۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔

"چلو چاچا ہمارے ساتھ چلو" وہ خوش ہو کر بول اٹھی۔ اس سے پہلے بھی اسے کئی دفعہ خیال آیا تھا کہ بوڑھے کو اپنے ہاں رکھ لے۔ لیکن اس کے

ہاں پہلے ہی سے دو تین نوکر تھے۔ اس کا شوہر کیا سمجھے گا کہ اتنا آرام رہ کر بھی ایک اور خادم چاہتی ہے۔ وہ اس کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔ لیکن زیادہ فرمائش کرنا یا کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر کرنا ثریا کو پسند نہ تھا۔ لیکن وہ اس کی اجازت کا انتظار نہ کر سکتی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کے خاطر چاچا کو ضرور نوکر رکھ لیں گے۔ آخر وہ بھی اتنا رحمدل تھا۔ "چلو گے چاچا میں تمہیں زیادہ کام نہ دوں گی۔ بس بچوں کو کھلا لو۔ سودا سلف لے آؤ۔ کیوں چلو گے چاچا؟"

بوڑھا کچھ دیر تک سر جھکائے رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دبی آواز میں آہستہ آہستہ کہا۔ "نہیں بٹیا میں نہیں آسکتا۔ میں یہ جگہ چھوڑ نہیں سکتا۔ ساری عمر یہیں گذری ہے۔ میرے باپ دادا اسی گاؤں میں رہے۔ میں بھی یہیں پیدا ہوا۔ یہیں پل کر بڑا ہوا...... یہ گھر ہمارے بابا کا ہے۔ اس کے گھر میں میں نے "اس" کے ساتھ بیس برس گذارے۔ وہ یہیں سو رہی ہے، میرے ماں باپ بھی یہیں دفن ہیں۔ میں گاؤں چھوڑ نہیں سکتا۔ بٹیا! مرنے کے دنوں میں پرائی بستی کیوں جاؤں۔ کہیں پردیس میں مر گیا تو اپنے وطن کی مٹی تک نصیب نہ ہو گی۔ میں یہیں کوشش کر کے کماؤں گا بٹیا کچھ ملا نہیں تو فاقہ کرتے کرتے جان آپ ہی نکل جائے گی۔ اب جینے کی کسے آرزو ہے۔"

وہ اسے مجبور نہ کر سکی۔

"تانگہ پر باندھنے کے لئے پردے دے دو بی بی۔ وقت بہت ہوچکا ہے۔" ملازم تانگہ لے کر آ گیا تھا۔ اس نے ننھے بچے کی چھالیوں کی پوٹلیاں اٹھا لیں "ملے یہ بستر بھی باندھ لے۔" ثریا نے اپنے چھوٹے تین ماہ بچے کو گود میں لے لیا۔ نوکر نے چھوٹے بچے کا بستر باندھ کر اٹھا لیا اور بڑے بچے کو بھی گود میں اٹھا لیا۔ "میں جاتی ہوں، چاچا۔ اللہ میاں تمہاری مصیبت دور کرے۔" وہ دعا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ "خوش رہو بیٹا۔" وہ ننھے بچے کو گود میں لے کر تانگہ میں بیٹھ گئی۔ تانگہ چل پڑا۔ بوڑھے کو جاتے ہوئے وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کے من پر ایک عجیب اداسی چھا رہی تھی۔

بوڑھا مایوس ہوچکا تھا۔ لیکن اب وہ بھی ڈپو جا رہا تھا۔ وہ ہر روز مایوس لوٹتا۔ کوئی اسے پوچھتا تک نہیں تھا۔ بھوک کی شدت سے نڈھال [illegible] اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب دم نکل ہی جائے گا۔ لیکن موت نہیں آتی [illegible] کے وقت موت بھی نہیں آتی۔ وہ صبح آٹھ بجے ہی ڈپو چلا جاتا تھا۔ اسے کام ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ پھر بھی وہ ڈپو کے بند ہونے تک وہیں رہتا بارہ بجے ملازم ڈپو بند کرنے لگے۔ دوسرے سب مزدور اپنے اپنے گھروں کو یا کسی کے گھر لکڑیاں چیرنے جا چکے تھے لیکن وہ نہ جانے کیوں ابھی

تک کھڑا رہا۔ کام ملنے کی امید تو کبھی کی مٹ چکی تھی۔ پھر بھی وہ کھڑا رہا۔ آخر گھر جا کر کیا کرے گا۔" اوہ ڈپو بند کر دی آپ نے؟ اگر مہربانی فرما کر آج ہی لکڑی دے سکیں تو۔ پھر کل مجھے فرصت نہیں۔ اور آج کل ہمارا نوکر بیمار ہے۔" کوئی سائیکل پر ابھی ابھی آیا تھا۔ دوکاندار نے پھر ڈپو کھول کر لکڑی تلوا دی۔ لکڑی تلوا کر بابو نے اِدھر اُدھر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا اور پھر اس کے پاس جھجکتا ہوا آیا۔ "کیا تم لکڑی اٹھانے والے ہو؟" "ہاں بابو جی۔" "لے چلو گے؟" "گھر یہیں ہے ہمارا۔" "اچھا بابو جی۔" "کیا لو گے؟" "وہی معمول کا بابو جی۔ روپے پر دو آنے۔" "اچھا اٹھا لو۔" ایک اور مزدور دور سے بھاگا آرہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کسی کے گھر لکڑیاں چیر کر آرہا تھا۔ وہ آتے ہی چلّایا۔ "میں لے چلوں گا بابو جی۔"

"نہیں، میں نے بوڑھے میاں سے بات کر لی ہے۔" بابو جی نے جواب دیا۔ بوڑھے نے موقع ہاتھ سے جاتے دیکھ کر جلدی سے لکڑیاں اٹھا لیں۔ "ہونہہ! اس کے ہاتھ سے کیا ہو سکے گا؟" لڑکے نے حقارت سے کہا۔ "میں آن کی آن میں پہنچا دوں گا آپ کے گھر۔ اور اسی وقت چیر کر بھی دے دوں گا۔"

"کیوں بوڑھے میاں تم نہیں چیرو گے؟" بابو نے پوچھا۔ "نہیں بابو۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ پہلے چیرا کرتا تھا بابو جی۔ پر اب فاقے کر کے کمزور ہو گیا ہوں کل سے کچھ نہیں کھایا ہے بابو کیسے چیر سکوں۔"

دیکھا بابوجی میں نہ کہتا تھا اس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔" لیکن بابو کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ "نہیں بوڑھے میاں کو اٹھا لانے دے تو بھی ساتھ چل کر لکڑیاں چیر دے۔ یوں دونوں کو کچھ مل جائے گا۔"

"مفت کیوں آؤں بابوجی۔ اتنی دور صرف چیرنے کے دس بارہ آنوں کے لئے۔" لڑکا چلنے لگا۔ "اِدھر آ۔" بابو نے اُسے پکارا۔ اُس کے گھر لکڑیوں کی بہت ضرورت تھی۔ اس کی بیوی نے کہا تھا کہ رات کا کھانا پکانے کو بالکل لکڑیاں نہیں ہیں۔ اب وہ چیرنے کے لئے کسی اور کو کہاں ڈھونڈتا پھرے؟ "ادھر آ۔" لڑکا مڑا۔ "ایسی باریک چیروں گا۔ بابوجی کہ بی بی جی بھی خوش ہو جائیں۔" لڑکے نے بابوجی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی نوکر نہ ہوگا۔ بی بی جی ہی پکاتی ہونگی۔ بس کھانا منٹوں میں پک جائے گا۔ مجھ سے باریک کوئی نہیں چیر سکتا۔ بابوجی!" بوڑھا ابھی تک لکڑیاں اٹھائے کھڑا تھا۔ بوجھ اٹھا کر جلدی جلدی چلتے جائیں تو اتنا درد محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جب اٹھائے کر ایک ہی جگہ کھڑے ہوں تو وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اس نے جوش میں آ کر دو روپے کی لکڑیاں ایک ہی وقت میں اٹھالی تھیں۔ بوجھ سے اس کے کندھے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ بابو کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ اُسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ "اچھا لو روپے کی لکڑی ڈیڑھ آنے میں لئے چلتا ہوں بابوجی۔" چھ پائی نے بابوجی سے فیصلہ کر ہی ڈالا۔ روپے پر چھ پائی تو چار روپے پر دو آنے کی کمی ہوئی۔ دو آنے ایک کلرک کے لئے بہت کچھ تھے۔

شکست

"اچھا رکھدو میاں۔ یہ لیجائیے گا" بابو نے کہا۔" اس نے خاموشی سے لکڑیاں اتار رکھدیں۔ ساری مایوسی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ لڑکے نے لکڑیاں اٹھالیں۔ وہ دونوں چل پڑے۔ وہ بہت دیر تک دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ ان کے اوجھل ہونے پر بھی یونہی کھڑا رہا۔ اپنے گردوپیش سے بے خبر! سورج برابر سر پر آگیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے آخری آس بھی ٹوٹ چکی ہو۔ جیسے اسکی شمع امید کی لو بجھنے سے پہلے آخری دفعہ تیز ہو کر لپکی تھی۔ پھر بجھ گئی۔ درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ یکایک وہ پھٹ پڑا۔ وہ ایسے رو رہا تھا۔ جیسے برسوں کی لاڈ سے پالی ہوئی بیٹی کی نعش پر آنسو بہا رہا ہو۔ پھر وہ آنسو پونچھ کر اٹھا آہستہ آہستہ چلنے لگا...... دور اسے گھر نظر آرہا تھا۔ وہ گھر پر نظریں جمائے چلا جا رہا تھا۔ وہ خود نہیں چل رہا تھا۔ کوئی نامعلوم طاقت اُسے بڑھائے لئے جا رہی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ دہلیز کے سامنے کا پتھر بہت گرم ہو چکا تھا۔ پاؤں جل اُٹھتے۔ وہ کبھی اس پاؤں پر، کبھی اس پاؤں پر بوجھ ڈالتا۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ کش مکش احساسات کی شدت سے سینے میں آگ سی لگی تھی۔ اس کا سر زور سے چکرایا۔ قریب تھا کہ گر پڑے لیکن اس نے بڑھ کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ اوپر اٹھا پھر رُک گیا۔ پھر بڑھا۔ پھر رُکا۔ پھر بڑھا آہستہ آہستہ، اور اس نے دروازہ کھٹکھٹایا! اپنی بیٹی کا دروازہ!——

میرے افسانے

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانچتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے سب سے بڑی
شکایت یہ ہے کہ میرا مشاہدہ بہت محدود ہے۔ مجھے ادب کے مطالعہ کا بہت کچھ موقع ملا ہے،
لیکن زندگی کے مطالعہ کا بہت کم۔ اس لئے میرے افسانوں کا دائرہ بھی محدود ہے
میرا یہ نظریہ ہے کہ قریبی مشاہدے اور گہرے مطالعے کے بغیر کسی اچھے اور گہرے افسانے
کی تخلیق مشکل ہے۔ ایسی زندگی کے متعلق یا ایسے موضوعات پر جن کے متعلق اس کے
معلومات محدود ہوں سطحی قسم کے افسانے لکھنے سے یہ بہتر ہے کہ ادیب اُسی زندگی
کی تصویر کھینچے جس سے وہ مانوس ہو، واقف ہو، اُسی ماحول کی جس میں وہ رہا ہو۔ یہ
تصویر زیادہ دیانت داری کے ساتھ کھینچی جا سکتی ہے۔ میرے ایک دو افسانے قریبی
مشاہدے اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں لیکن اکثر میری اپنی زندگی اور تجربے کے محور کے گرد اگرد
ہی گھومتے ہیں۔ ہاں، یہ میری تمنا ہے کہ اپنے آپ سے باہر ہو کر لکھ سکوں، اور پوری معروضیت
بھی برت سکوں...... اور اپنے بالکل تازہ افسانے "دیپک راگ" میں

مجھے بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس افسانے میں میں نے جنس، محبت اور ازدواجی زندگی کے وسیع مسئلے کو کچھ وسعت سے گھیرنے کی کوشش کی ہے، سات مختلف تصویروں کے ذریعے۔ ازدواجی زندگی میرے کئی افسانوں کا محور رہی ہے لیکن ان افسانوں میں صرف ایک ہی رخ پیش ہوا تھا۔ کامیاب ازدواجی زندگی، میاں بیوی میں محبت — محبت جو صرف جنسی کشش پر نہیں، ایک گہرے انسانی تعلق پر مبنی ہے...... میاں بیوی ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، زندگی کے سفر میں ہمراہی ہیں۔ خوشیوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی، دکھ درد میں بھی ساتھی...... "اپنی نگریا" میں اس کی جھلکیاں ہیں۔ "گھنیری بدلیوں" میں —— اسکی تفصیلی تصویر۔ "آئینہ"، "رانی" اور "شکست" اور "آندھی میں چراغ" میں نچلے طبقے میں اُس محبت اور رفاقت کی جھلک ہے۔ غریبوں کی مصیبت بھری زندگی میں بھی شوہر، بیوی اور بچوں کا پیار ایک ایسی کرن ہے جو تاریکی میں ذرا سا اجالا پیدا کرتی ہے۔ ایک ایسی ٹھنڈک، جس سے زندگی قابلِ برداشت بن جاتی ہے۔

گو مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ ایک ہی رُخ ہے، ایک ہی پہلو۔ پھر بھی اپنے کئی افسانوں میں یہ ایک ہی رخ پیش کرنے کی ایک وجہ بھی ہے...... مجھے اس کا بڑی شدت سے احساس ہو چلا تھا کہ جدید افسانہ نگار زندگی اور انسانی کردار کے تاریک پہلوؤں پر بہت زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ ہمیشہ زندگی کے تاریک رخ کی عکاسی سے ہمارے ادب پر یاسیت اور قنوطیت چھاتی چلی جا رہی ہے جو امید کا گلا گھونٹ رہی ہے اور انسانی کردار کے ہمیشہ تاریک پہلو پیش کرنے سے (گو ترقی پسند افسانہ نگار ایسی تصویریں انسانی کردار اور فطرت کی مذمت میں نہیں، یہ بتانے کے لئے پیش کرتے ہیں کہ موجودہ سماج اور نظام نے ایسے انسان کی تخلیق کی ہے) اور زیادہ اثر پیدا کرنے

اور برائیوں سے نفرت دلانے کے لئے اس تاریکی کو بہت ہی سیاہ رنگ دینے سے انسانی فطرت پر سے بھروسہ اٹھ جانے کا اندیشہ ہے ہمیشہ اسی طرح کے افسانے پڑھتے پڑھتے یہ احساس ہونے لگتا ہے گویا انسانیت دم توڑ چکی ہے۔ ہاں تاریکی بہت زیادہ ہے روشنی کے محض چند بکھرے ہوئے ذرّے ہیں...... پھر بھی اس روشنی کو کم از کم اسی تناسب میں پیش کیا جائے جیسے وہ زندگی میں ہے تو کچھ امید قائم رہتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ اچھے اور پاکیزہ کردار پیش کرنے سے یہ احساس باقی رہتا ہے کہ تند ہوا کے تھپیڑوں سے، انسانیت کی شمع بالکل بجھ نہیں گئی ہے، ٹمٹما رہی ہے، اس کی لو کانپ کر بجھا چاہتی ہے لیکن ساز گار ماحول میں پھر سے تیز ہو سکتی ہے اور ترقی پسند ادیبوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ یہ احساس بھی دلائیں مستقبل پر امید اور انسان پر بھروسہ

خصوصیت سے جدید اردو ادب کے درمیانی دور میں (شروع میں جنسیات کی اتنی بہتات نہیں تھی، اور خوشی کی بات ہے کہ اب نہیں رہی) حقیقت نگاری صرف جنسی حقیقت نگاری (Sex Realism) بن کر رہ گئی تھی۔ اور یہاں بھی صرف ایک رُخ پیش کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف جنسی بیماریوں (جسمانی ہی نہیں نفسیاتی بھی) جنسی کج رویوں اور جنسی بدعنوانیوں، جنسی بھوک اور جنسی ناآسودگی کی داستانیں بکھری پڑی تھیں۔ اور مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس سے بڑا ہی غیر صحت مند اثر پڑ رہا ہے، اس کی بہت ضرورت ہے کہ تندرست جنسی زندگی، صحت مند محبت اور کامیاب خوشگوار متاہلانہ زندگی کی بھی جو جنسی زندگی کی (anarchy) بے ترتیبی بے اعتدالی میں ایک مستقل، پائیدار اور استوار چیز ہے۔ چند تصویریں پیش کی جائیں۔ اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تخئیلی تصویر کھینچی جائے یا کوئی مثالی نمونے سامنے رکھے جائیں۔ زندگی میں ایسی تصویریں بھی موجود ہیں۔ اور میرے یہ چند افسانے اس سلسلے میں ایک روشن پہلو پیش کرنے کی ایک

چھوٹی سی کوشش ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اس خاص مقصد کو سامنے رکھ کر افسانے لکھے ہیں بلکہ یہ کہ انہیں لکھتے وقت اس احساس کو بھی دخل تھا...... میرے بعض افسانے چنانچہ "شکست" اور "رانی" ایک حد تک شعوری کوششوں کا نتیجہ ہیں۔
لیکن اکثر کسی
مقصد یا شعوری کوشش سے زیادہ احساس اور وجدان میرے افسانوں کا محرک ہوتا ہے
تکنیک میں کوئی تجربہ کرنے کا خیال بھی میرے کسی افسانہ کا محرک نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا ہر افسانہ الگ تکنیک میں ہے۔ اور یہ بات اتنی غیر شعوری بھی نہیں لیکن موضوع چننے، مواد کو ذہن میں جمع کرنے، افسانے کی تفصیلیں، پلاٹ، واقعات یہ سب سوچنے سے پہلے میں نے کبھی تکنیک کا خیال نہیں کیا۔ ہاں یہ سب باتیں ذہن میں جم جانے کے بعد تکنیک کی طرف ضرور توجہ کی ہے کہ اس مواد کو کس تکنیک میں ڈھالا جائے تو اچھا لگے گا۔ اور زیادہ اثر پیدا ہو سکے گا۔ ہر افسانے کی تکنیک مختلف ہے۔
"انگڑائی"، "آئینہ"، "گھنیری بدلیوں میں"—— ان تینوں میں ظاہری عمل اور گفتگو سے زیادہ داخلی احساسات اور ذہنی تصورات ہیں لیکن یہ الگ الگ طرح پیش کئے گئے ہیں۔ "انگڑائی" کا وقفہ بہت کم ہے ایک آدھ گھنٹہ کا اور پچھلی محبت کی جو تفصیلی تصویر اور دو محبتوں میں جو تقابل بتایا ہے اس میں Reflection اور Narration کا امتزاج ہے یعنی لڑکی کی جو باتیں یاد آرہی ہیں وہ انہیں تفصیل سے سناتی جارہی ہے۔ "آئینہ" میں بھی اسی طرح ان دونوں کا امتزاج ہے۔ لڑکی کے ذہن میں جو واقعات گھوم جاتے ہیں انہیں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ

(یعنی جو کچھ اس کے ذہن میں آتا ہے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ) Narration کے ذریعہ بیان ہوا ہے لیکن "انگڑائی" میں جہاں حال کے سین اور ماضی کے سین باری باری Alternate طور پر لائے گئے ہیں۔ "آئینہ" میں حال سے اچانک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور پچھلی داستان تفصیل سے بیان ہونے کے بعد افسانہ پھر حال میں آتا ہے۔ اور وہیں ختم ہوتا ہے، اور اختتام میں جب روشنی گھوم کر پھر اسی پہلے سین پر پڑتی ہے تو ایک چونکا دینے والا احساس ہوتا ہے۔ "آئینہ" کی تکنیک گالز وردی کے "سیب کا درخت" کی سی ہے لیکن "سیب کا درخت" میں ایک شفٹ ہے۔ "آئینہ" میں ڈبل شفٹ۔ ایک تو داستان۔ اس سے شفٹ ہو کر پروین کے بچپن کی طرف جاتی ہے جب نانی بی اس کی انّا تھی۔ پھر آئینہ ملنے کے بعد ایک مرتبہ اور شفٹ ہو کر خود نانی بی کی پچھلی زندگی کی طرف جاتی ہے اور ان دونوں حصوں میں نانی بی کی زندگی کی داستان پوری ہو جاتی ہے اور جس طرح "سیب کا درخت" گالز وردی کے آنے والی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "آئینہ" میں آئینہ (جس میں پروین اپنی صورت دیکھ رہی ہوتی ہے) آگے بیان کی جانے والی داستان طرف ایک اشارہ ہے۔ "گھنیری بدلیوں میں" ایک نہایت مضطرب ذہن کی تصویر ہے۔ لڑکی کے دل میں رنج و غم کا طوفان اُمڈا ہوا ہے۔ اس کے دماغ میں بھی طوفان ہے۔ خیالات کھول رہے ہیں مضطرب ادر بے چین لہریں ٹکرا رہی ہیں، پھر دوسری لہریں ابھرتی ہیں۔ اور ایک لہر دوسری لہر کو کاٹتی جاتی ہے (یعنی متضاد خیالات، خیالات میں کشمکش) پھر اس کے دل پر چھائی ہوئی غم کی بدلیاں برس کر آہستہ آہستہ چھٹ جاتی ہیں۔ تو یہ طوفان بھی آہستہ آہستہ تھم جاتا ہے اور آخر میں ایک سکون کا احساس ہے۔

"رانی"، "شکست" اور "اپنی نگریا" میں گفتگو اور عمل زیادہ ہے۔ اور افسانہ نگار کی طرف سے براہِ راست بیان۔ "رانی" ایک دن کا افسانہ ہے۔ ایک ہی کردار کی داستان ہے لیکن پس منظر کچھ وسیع ہے۔ "شکست" میں مہینوں کا عرصہ ہے۔ "شکست" ایک معمولی بیانیہ ہے روز روز کے واقعات سادگی سے، اسی ترتیب میں بیان کر دیئے گئے ہیں جیسے وہ پیش آئے ہیں۔ "شکست" ایک زندگی کی داستان ہے۔ زندگی کی طرح آہستہ آہستہ گھسٹتی جاتی ہے۔ "اپنی نگریا" میں Direct واقعیت ہے اور اصلی ناموں اور اصلی واقعات کی وجہ اس کی تکنیک رپورتاژ کی سی لگتی ہے، لیکن "اپنی نگریا" رپورتاژ نہیں ہے۔ اس میں افسانویت ہے اور ایک مرکزی خیال ایک اور بات "اپنی نگریا" میں Person کی تبدیلی ہے ایک ہی آدمی کے لیے صیغۂ غائب کا اور صیغۂ متکلم کا استعمال ہوا ہے۔ ناز نسرین alternate پیراگراف میں 'میں' سے 'وہ'، 'وہ' سے 'میں' بن جاتی ہے۔ میں نے یہ افسانہ لکھنے سے کچھ پہلے ولیم سارویں کا وہ افسانہ پڑھا تھا جس میں یہ انداز ہے اور یہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا۔ اور چونکہ "اپنی نگریا"، ہمارا اپنا افسانہ ہے اور پڑھنے والوں پر بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارا افسانہ ہے میں نے اس میں سارویں کی اس دلچسپ جدت کا استعمال کیا ہے۔ گو یہ تو ظاہر ہے کہ 'وہ' اور 'میں' ایک ہی ہیں لیکن پھر بھی پڑھتے وقت ہر موڑ پر ایک ہلکے سے تذبذب اور حیرانی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ دلچسپی میں اضافہ کر دیتی ہے۔

میرے افسانوں میں شاید تلخی نہیں ہے۔ جہاں درد ہے وہ دھیما، آہستہ آہستہ چھاننے والا درد ہے۔ "رانی" اور "گھنیری بدلیوں میں"—— اس درد کے بعد ایک

سکون اور ہلکی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ "آئینہ" اور "شکست" میں درد شروع سے آخر تک چھایا ہوا ہے لیکن ان میں یاسیت نہیں آنے پائی کیونکہ یاسیت کے احساس کو ایک اور چیز نے چھپا لیا ہے، جو ہمارے ذہن میں آہستہ آہستہ سرایت کر جاتی ہے یعنی انسان کی بلندی کا احساس۔ "آئینہ" میں وہ شدید محبت اور وفاشعاری اور "شکست" میں وہ غیرت اور خودداری۔ غربت اور ناسازگار حالات نے ان کے جسموں کو ادھ موا کر دیا تھا، زندگی ان پر بوجھ تھی۔ ان کا جسم مر چکا تھا لیکن ان کی روح زندہ تھی......

کہیں کہیں میرے افسانوں میں جنوبی ہند کی معاشرت کی جھلکیاں ہیں خصوصاً "آئینہ" "رانی" اور "شکست" میں۔ ان افسانوں میں یہاں کی مروجہ زبان کے الفاظ اور یہاں کے نچلے طبقے کے لوگوں کا لہجہ (Dialect) بھی ملتا ہے۔

جہاں تک موضوع کا سوال ہے۔ گو میرا پسندیدہ موضوع ازدواجی محبت نظر آتا ہے لیکن افسانوں میں یہ سارے افسانے کو گھیرے ہوئے نہیں ہے۔ میں نے اپنے محدود مشاہدے اور دائرے میں ہی کافی متنوع موضوع چننے کی کوشش کی ہے۔ "رانی" بھی گو ایک محبت کرنے والی بیوی کی کہانی ہے جو اپنے شوہر کی ایک محبت بھری نظر اور ایک میٹھے جملے میں اپنی ساری تکلیفیں بھول جاتی ہے لیکن یہ داستان راشننگ کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی غذا کے اس کنٹرول کا الگ الگ طبقوں پر کس طرح الگ الگ اثر پڑا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ گوری کی داستان صرف ایک ہلکا سا جال ہے۔ "شکست" ایک غریب لیکن نہایت خوددار اور غیرتمند بوڑھے کی کہانی ہے جو آخر تک ناسازگار حالات کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا ہے لیکن آخر یہ اُسے شکست دے ہی دیتے ہیں

"آئینہ" ایک انسانی کہانی ہے۔ یہ کہنا کہ اس کا کوئی خاص موضوع ہے، اس کو محدود کرنا ہے۔ اس میں ایک زندگی ہے اور زندگی کی ٹریجڈی! ہم رومان اور محبت کے ساتھ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا خیال کرتے ہیں، نوجوان اور خوبصورت! لیکن ایک بدصورت بوڑھے یا بڑھیا کو دیکھ کر ہمیں اس کا خواب میں بھی خیال نہیں آتا کہ ان کی اپنی محبتیں بھی ہیں، وہ بھی اپنے وقت میں ایسی زندگی سے گذرے ہیں۔ یہ زندگی ان میں مرچکی ہے۔ گدلی آنکھیں، جھریوں دار جذبات سے عاری چہرہ، سوکھا سینہ، کسے خیال آسکے گا کہ اس راکھ میں کتنی آگ ہے، ان گدلائی ہوئی آنکھوں کے پردوں کے پیچھے اور اس سوکھے، تلاطم سے عاری سینے میں کیسے گہرے داغ دفن ہیں، جو اس جسم کو اندر ہی اندر جلا کر اس کی زندگی آہستہ آہستہ ختم کر رہے ہیں۔ کوئی اسے نہیں جان سکتا، کسی کو بھی ان جذبات سے عاری جھریوں دار چہروں اور ان گدلائی ہوئی آنکھوں سے ہمدردی نہیں ہوتی..... مجھے اپنے کسی کردار سے اتنی ہمدردی، اتنی محبت نہیں ہے جتنی اس افسانے کی "نانی بی" سے! اور میرا خیال ہے کہ گو میرے دوسرے کئی افسانوں کے کردار حقیقی ہیں، زندگی سے لئے گئے ہیں۔ نانی بی کا کردار ان سب سے زیادہ حقیقی، زندگی سے لیا ہوا معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ کردار میری تخلیق ہے، میرے ذہن کی پیداوار "شکست" میں ایک کردار کی تعمیر کی خاص کوشش کی گئی ہے۔ گو یہ کردار بھی میں نے اسکی پوری زندگی کے پس منظر میں ابھارا ہے، پھر بھی خصوصیت سے ایسے واقعات دیئے گئے ہیں جن میں بوڑھے کی خودداری ظاہر ہو۔ "شکست" کا "پھکڑ دادا" ایک Flat کردار ہے ای۔ یم۔ فارسٹر نے Round اور Flat کرداروں میں تمیز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک Flat کردار کی صفتیں واضح اور بہت جلد نظر آنے والی ہوتی ہیں۔ ہم آسانی سے ایک ہی جملے میں اس کے کردار کا نچوڑ دے سکتے ہیں! اور یہاں "شکست" میں ہم فوراً

کہہ سکتے ہیں کہ یہ بوڑھا نہایت خوددار ہے ...... اس کے برخلاف "آئینہ" میں ایک مکمل انسانی کردار ہے۔ اس افسانہ کی Poignancy اور Pathos "شکست" سے کہیں زیادہ ہے اتنی گہرائی میرے کسی اور افسانے میں نہیں ہے۔ "آئینہ" میرا بہترین افسانہ ہے۔

"گھنیری بدلیوں میں"۔ "اپنی نگریا" اور "انگڑائی" بڑی حد تک آٹو بیاگرافک ہیں اس میں موضوع الگ ہیں۔ "گھنیری بدلیوں میں" کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ اس میں بھی میاں بیوی کی محبت ہے اور ...... یہ کہ اس شدید محبت کی وجہ سے بیوی کو شوہر کی معمولی مصروفیتیں بھی اپنی رقیب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس افسانے میں جو خاص بات ہے، وہ اس کا پیش کرنے کا انداز ہے۔ "اپنی نگریا" میں ایک رسالے کے ایڈیٹر کی مجبوریاں اور دشواریوں کی تفصیل ہے۔ لیکن اس کا مرکزی خیال عوام کے ذوق کی ایڈیٹر کے اعلیٰ ذوق سے ٹکر ہے اور ایڈیٹر کی شکست۔ "انگڑائی" میں میلانِ ہم جنسی کو ایک خاص رنگ میں بتایا ہے۔ "انگڑائی" میرا سب سے پسندیدہ افسانہ ہے شاید اس لئے کہ یہ میری بالکل پہلی کوشش ہے۔ اور اس وقت لکھا گیا جب میں خود ابھی ابھی گلنار کے اسٹیج سے گذری تھی۔ اور اس لئے بھی کہ یہ صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے اس میں ایک بڑا ہی صحتمند نظریہ ہے۔ اردو کے کسی افسانے میں میلانِ ہم جنسی کے متعلق ایسا صحتمند نظریہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں میلانِ ہم جنسی ایک بیماری کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور شدید صورت میں جسمانی گناہ کے ساتھ۔ "انگڑائی" میں احساسات ہیں صرف ایک جذباتی قسم کی محبت ہے جو Adolescence کے دور میں تقریباً ہر لڑکے اور لڑکی کو شدید یا ہلکی صورت میں ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس عمر میں یہ میلان تو ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے خصوصیت سے جب دوسری جنس کے افراد سے ملنا جلنا نہ ہو تو اس کا امکان بہت زیادہ ہے۔ "انگڑائی" میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک خاص اسٹیج کے بعد

یہ میلان جاتا رہتا ہے۔ اور دوسری جنس سے صحتمند محبت ہوسکتی ہے۔ "انگڑائی" کی ہیروئن گلنار ایک نوخیز لڑکی ہے۔ اسے اپنے کالج کی ٹیچر سے ایک طرح کی جذباتی محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں جب اس کی شادی ٹھہرائی جاتی ہے وہ اپنے منسوب کی طرف بے اختیار کھنچ جاتی ہے۔ میلانِ ہم جنسی پر مخالف جنس کی کشش کا غلبہ — یہ تبدیلی "انگڑائی" میں بڑے غیر محسوس طریقے پر بتائی گئی ہے، بہت نرمی سے، اتنی نرمی سے جیسے گلنار کو خود بھی اس تبدیلی کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ وہ اب اپنی اس پہلی محبوب سے بے پرواہی نہیں ہو جاتی، بلکہ اپنے نئے محبوب (مرد) کا ذکر کر کے اُسے جلانا چاہتی ہے۔ وہ پہلی محبت جیسے ایک خواب تھی۔ اب وہ ایک انگڑائی لے کر اس نیند سے بیدار ہوتی ہے۔ اور مسکراتی ہوئی اپنے مستقبل کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جیسے ماضی کی زندگی رات بھر کی تکان تھی، جیسے وہ باہوں کی ایک لچک کے ساتھ دور کرنا چاہتی ہے۔ اور اس نئی صبح کی خوشگوار فضا میں انگڑائی لیتی ہوئی وہ اپنے آپ میں ایک نئی تازگی محسوس کرتی ہے.........

"اپنی نگریا" کے افسانے میری زندگی کے ایک دور کا نقش ہیں۔

ستمبر ۱۹۴۷ء